www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

December 2013 • No. 445 • Rs. 15

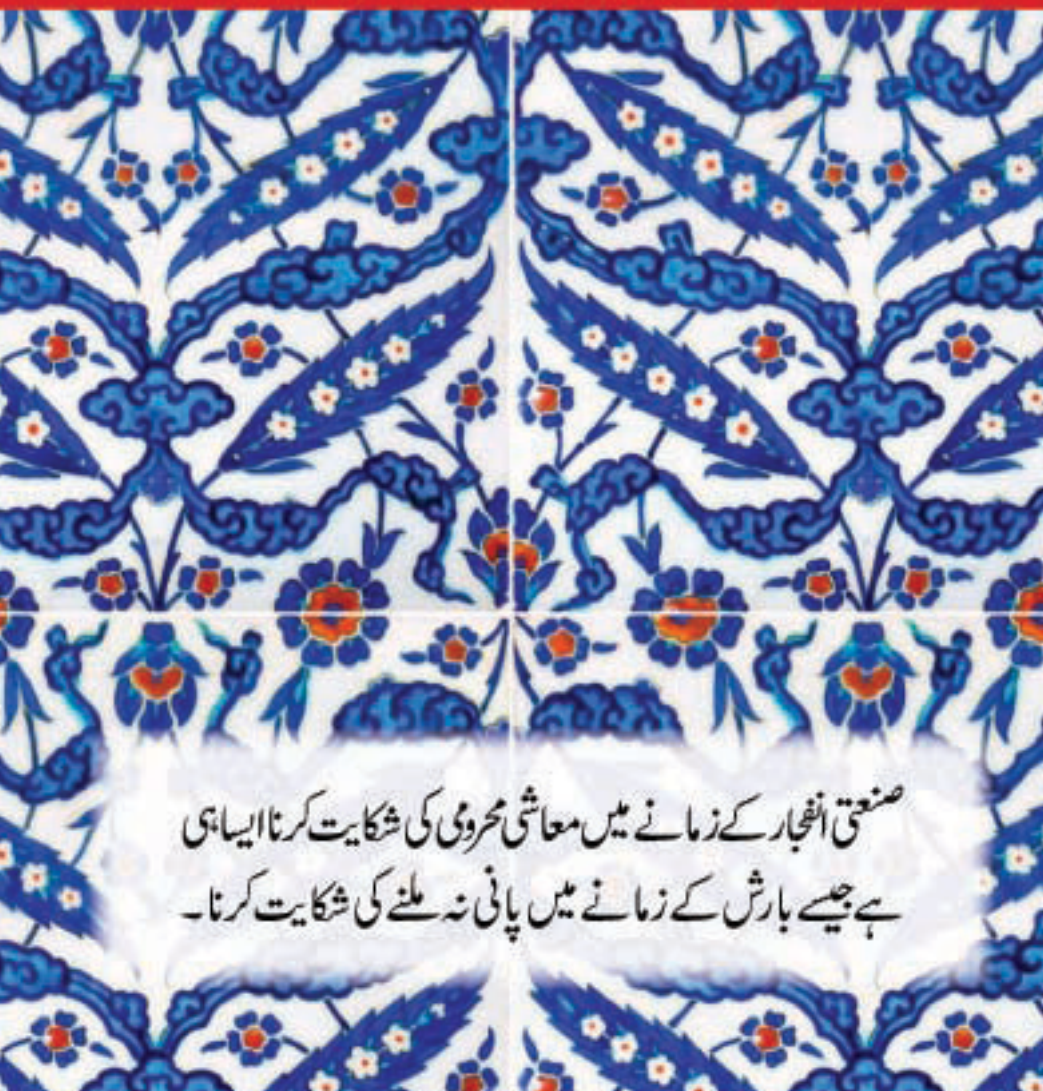

صنعتی انفجار کے زمانے میں معاشی محرومی کی شکایت کرنا ایسا ہی
ہے جیسے بارش کے زمانے میں پانی نہ ملنے کی شکایت کرنا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

دسمبر 2013

خصوصی شمارہ

حدیثِ رسول — ایک مطالعہ

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

حدیثِ رسول — ایک مطالعہ

قرآن اور حدیث

خالص علمی اعتبار سے، قرآن اور حدیث میں کوئی فرق نہیں۔ جس پیغمبر کی زبان سے حدیث کے الفاظ نکلے ہیں، قرآن کا کلام بھی یقینی طور پر اُسی پیغمبر کے ذریعے حاصل ہوا ہے۔ گویا کہ عام حدیث اگر صرف حدیث ہے تو قرآن کی حیثیت حدیثِ قدسی کی ہے۔ حدیث کے معاملے میں اگر راوی یہ کہتا ہے کہ: سمعتُ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تو قرآن کے معاملے میں پیغمبر یہ کہتا ہے کہ: سمعتُ عن جبریل۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق براہِ راست نہیں ہے، بلکہ ہمارے اور قرآن کے درمیان ایک پیغمبر کا واسطہ موجود ہے۔ اگر پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو قرآن ہمارے لیے صرف لائبریری کی ایک کتاب کے مانند ہو جائے گا، وہ خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام نہ رہے گا۔ اِس کے بعد قرآن کے حق میں وہ تاریخی اعتباریت (historical credibility) ہی باقی نہ رہے گی جس کی بنیاد پر ہم قرآن کو خدا کا ایک معتبر کلام مانتے ہیں۔

کسی کا یہ کہنا کہ میں قرآن کو مانتا ہوں، مگر میں حدیث کو نہیں مانتا، یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بظاہر قرآن کو مانتے ہوئے قرآن کا انکار کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن راویوں کے ذریعے ہم کو حدیثِ رسول پہنچی ہے، اُنھیں راویوں کے ذریعے ہم کو قرآن بھی ملا ہے۔ آج جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے، وہ براہِ راست ہم پر نہیں اترا۔ وہ ٹھیک اُسی سلسلۂ روایت کے ذریعے ہم کو ملا ہے جس سلسلۂ روایت کے ذریعے احادیث رسول ہم تک پہنچی ہیں۔ ایسی حالت میں ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا، خالص غیر منطقی اور غیر علمی بات ہے۔ ایسے موقف کے لیے حقیقی طور پر کوئی جواز موجود نہیں۔

حدیث، ایک اعتبار سے، قرآن کے انطباق (application) کو بتاتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ہے کہ تم اللہ کا ذکر کثیر (33:41) کرو۔ اِس آیت کا عملی انطباق ہم کو حدیث کے ذریعے

معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ: كان النبي صلى الله عليه وسلم يذكر الله على كلّ أحيانه (صحيح البخاري، رقم الحديث:597)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ہر موقع (occasion) کو اللہ کی یاد کے لیے پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بناتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مستند طور پر بتاتا ہے کہ قرآن کی اصولی تعلیم کا عملی انطباق کیا ہے۔

کتاب اور سنت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری زمانے میں صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ترکتُ فیکم أمرین، لن تضلوا ما تمسّکتم بهما: کتاب الله وسنّة رسوله (موطّأ، رقم: 1619) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب صحابہ کے واسطے سے، تمام امت سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ تم ہرگز گم راہ نہیں ہوگے، جب تک تم اِن دونوں چیزوں کو پکڑے رہوگے۔ یہ دو چیزیں ہیں — اللہ کی کتاب، اور اُس کے رسول کی سنت۔

قرآن اور سنت دونوں یکساں طور پر ہدایت الٰہی کا ماخذ ہیں۔ آج قرآن ایک چھپی ہوئی کتاب کی صورت میں ہر ایک کے پاس موجود ہے، لیکن ساتویں صدی عیسوی میں جب قرآن، کلامِ الٰہی کی حیثیت سے اترا تو وہ کتاب کی صورت میں نہیں اترا تھا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوا تھا۔ معاصر اہلِ ایمان نے جس طرح حدیث کو پیغمبر کی زبان سے سنا، اُسی طرح انھوں نے قرآن کو بھی پیغمبر کی زبان سے سنا۔ پیغمبر کے بتانے سے سننے والوں نے یہ جانا کہ قرآن، اللہ کا کلام ہے۔ گویا کہ عام حدیث اگر حدیثِ رسول ہے تو قرآن کی حیثیت حدیثِ قدسی کی ہے۔

حسبنا کتاب الله

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے، ہدایت کے لیے ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک نیا ظاہرہ ہے جو موجودہ زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی یہ ذہن موجود نہ تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ساتویں صدی عیسوی میں خوارج کے نام سے جو فرقہ ظاہر ہوا، وہ یہی ذہن رکھتا تھا۔ علی اور معاویہ کے درمیان جو نزاع پیدا ہوئی، اس کے تصفیہ کے لیے خوارج نے قرآن کا

حوالہ دیا تھا۔انھوں نے قرآن کو نیزے پر اٹھایا اور یہ نعرہ بلند کیا: حسبنا کتاب اللہ۔

قدیم زمانے کے خوارج آج کل کی اصطلاح میں ''اہلِ قرآن'' نہ تھے۔انھوں نے حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ حدیث کے مقابلے میں نہیں دیا تھا، وہ صرف اِس معنی میں تھا کہ قرآن کی آیت: حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (4:35) کے مطابق، اِس معاملے کو تحکیم کے اصول کے مطابق حل کیا جائے، یعنی ایک حکم (arbitrator) علی بن ابی طالب کے گروہ سے لیا جائے اور دوسرا حکم معاویہ بن ابی سفیان کے گروہ سے لیا جائے۔اور یہ دونوں حکم باہمی گفت وشنید سے جو فیصلہ دیں، اس کو دونوں گروہ مان لیں۔چناں چہ تاریخ بتاتی ہے کہ ابوموسی اشعری اور عمرو بن العاص حکم کے طور پر مقرر کئے گئے اور اِس کے مطابق فیصلے کا اعلان کیا گیا۔

قرآن اور حدیث کا تعلق

یہ ایک حقیقت ہے کہ دینِ اسلام کا مستند ماخذ قرآن بھی ہے اور حدیث (سنت) بھی۔قرآن سے مراد وہ مجموعہ ہے جو وحی کی بنیاد پر مرتب ہوا اور جس کے اندر 114 سورتیں ہیں۔سنتِ رسول فنی تعریف (definition) کے مطابق، تین چیزوں کا نام ہے — قول، عمل، اور تقریر۔قول سے مراد وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مختلف مواقع پر ادا ہوئے۔عمل سے مراد وہ چیزیں ہیں جو آپ نے خود کر کے دکھایا۔تقریر سے مراد وہ چیز ہے جو آپ کے سامنے کی گئی اور آپ نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی تائید فرمائی۔انھیں دونوں چیزوں (قرآن اور سنت) کے مجموعے کا نام دینِ اسلام ہے۔یہ دونوں چیزیں یکساں طور پر اسلامی احکام کا ماخذ ہیں۔

تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔وہ فرق یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن میں دین کی اساسات بیان کی گئی ہے اور حدیث سے ہم کو دین کی تفصیلات کا علم حاصل ہوتا ہے۔اساسات اور تفصیلات کا یہ فرق بالکل فطری ہے۔یہ فرق ہر جگہ موجود رہتا ہے، خواہ دینی علم کا معاملہ ہو، یا سیکولر علم کا معاملہ۔مثال کے طور پر سائنس کے دو شعبے مانے جاتے ہیں — خالص سائنس (pure science)، اور انطباقی سائنس (applied science)۔یہی معاملہ اسلام کا ہے۔اسلام میں بھی ایک

خالص اسلام (pure Islam) ہے، اور دوسرا انطباقی اسلام (applied Islam) ہے۔ اِس تقسیم کو دین اور شریعت کے الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے یا اُس پر عمل کرنے کے لیے اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت یکساں طور پر ضروری ہے۔ اِس سلسلے میں یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں، جن سے اِس معاملے کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔

غلط تقابل

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے، ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں، وہ دراصل ایک غلط تقابل (wrong comparision) کا شکار ہیں۔ جب وہ قرآن کا نام لیتے ہیں تو اُن کے ذہن میں وہ قرآن ہوتا ہے جو آج چھپا ہوا مجلد صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے۔ اِس کے برعکس، جب وہ حدیث کا ذکر کرتے ہیں تو اُس وقت اُن کے ذہن میں ابتدائی دور کی وہ تاریخ ہوتی ہے، جب کہ حدیث کا ذخیرہ منتشر صورت میں تھا اور اُس کو مدوّن صورت میں جمع کیا گیا۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ کرتے ہیں کہ آج کے مطبوعہ قرآن کا تقابل، ماضی کے اُس ذخیرہ حدیث سے کرتے ہیں، جب کہ حدیثیں منتشر طور پر غیر مطبوعہ صورت میں موجود تھیں۔ حالاں کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں کا تقابل قبل از تدوین حالت اور بعد از تدوین حالت سے کیا جائے، یعنی مطبوعہ قرآن کا تقابل، مطبوعہ حدیث سے کیا جائے اور اِسی طرح غیر مطبوعہ قرآن کا تقابل، غیرہ مطبوعہ حدیث سے۔

تاریخ کے مطابق، قرآن اور حدیث دونوں ہی پر دو مختلف دور گزرے ہیں، یعنی قبل از تدوین دور، اور بعد از تدوین دور۔ اِس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قبل از تدوین قرآن کا تقابل، قبل از تدوین حدیث سے کیا جائے، اور بعد از تدوین قرآن کا تقابل بعد از تدوین قرآن سے کیا جائے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اِس طرح کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں، اُن کے ساتھ عملاً یہی ہوتا ہے کہ وہ حدیث کا انکار کرنے والوں کا لٹریچر پڑھتے ہیں اور اس سے متاثر ہوجاتے ہیں، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے مطالعے کی تکمیل کے لیے قرآن کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اگر ایسے لوگ دوطرفہ مطالعہ کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ جس بنیاد پر وہ حدیث کے استناد کو رد کررہے ہیں، اگر وہ بنیاد

علمی طور پر درست ہے تو اِسی بنیاد پر اُنھیں قرآن کے استناد کو بھی رد کرنا پڑے گا۔ اُنھیں یا تو دونوں کو لینا ہے، یا دونوں کو رد کرنا ہے۔ مگر وہ اِس معاملے میں تیسرا انتخاب (third option) لیے ہوئے ہیں، اور اِس طرح کے معاملے میں کبھی تیسرا انتخاب درست نہیں ہوتا۔

حدیث کی تدوین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اُس وقت حدیثیں زیادہ تر صحابہ کے حافظے میں تھیں۔ وہ مختلف مقامات پر اُن کا چرچا کرتے رہے۔ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (وفات: 720ء) کو یہ خیال ہوا کہ جس طرح قرآن کی تدوین ہوئی ہے، اسی طرح حدیث کی بھی تدوین کر دی جائے۔ اِس سلسلے میں صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه، فإني خفت دروسَ العلم وذهاب العلماء (صحيح البخاري، رقم الحديث: 97) یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک تابعی عالم ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھیلی ہوئی احادیث کو جمع کرو اور ان کو قیدِ تحریر میں لاؤ۔ کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ علم مٹ جائے اور علما باقی نہ رہیں۔ اِسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اُس زمانے کے ایک مشہور تابعی عالم محمد بن شہاب الزہری (وفات: 124 ہجری) کو حدیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح انھوں نے اسلامی ملکوں کے دوسرے حکام کو بھی ذخائر حدیث کے جمع وتدوین کا تاکیدی حکم بطور فرمان بھیجا۔

اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز، اسلامی ریاست کے تحت، احادیث کو مدوّن کرنا چاہتے تھے، لیکن جلد ہی خلیفہ کی وفات ہوگئی اور یہ کام اُس وقت انجام نہ پا سکا۔ اِس کے بعد عباسی خلافت کا زمانہ آیا۔ اُس وقت علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت نے بطور خود اِس کام کو انجام دیا، جن کو محدثین کہا جاتا ہے۔

حفاظتِ قرآن، حفاظتِ حدیث

حفاظت قرآن کا طریقہ جو دورِ نبوت میں اختیار کیا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کا کوئی حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتا تو آپ اس کو بول کر لکھوا دیتے۔ اس کام کے لیے صحابہ میں کئی لوگ مقرر تھے جن کو

کُتّاب کہا جاتا ہے۔ لکھنے کا یہ کام املا (dictation) کے ذریعے ہوتا تھا۔

اُس زمانے میں کاغذ بہت کم یاب تھا، اِس لیے لوگ مختلف چیزوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً جھلّی پر یا لکڑی پر یا پتھر کے ٹکڑوں پر، وغیرہ۔ اِس طرح وحی اور کتابت دونوں کا سلسلہ مسلسل طور پر جاری رہا۔ صحابہ میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ تھے جنھوں نے پورے قرآن کو حفظ کرلیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اُس وقت ہزاروں لوگوں کے حافظے میں قرآن محفوظ تھا۔ اِسی کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں متفرق چیزوں پر قرآن لکھا ہوا بھی پایا جاتا تھا۔

اول دن سے ایسا ہوا کہ قرآن عبادت کے طور پر ہر مسجد اور ہر گھر میں مسلسل طور پر پڑھا جانے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ قرآن کو ایک جلد کی صورت میں لکھ کر تیار کر دیا جائے۔ خلیفہ اول ابوبکر بن ابی قحافہ نے اِس مقصد کے لیے مشہور کاتبِ وحی زید بن ثابت الانصاری (وفات: 665ء) کو مقرر کیا۔ وہ روزانہ مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ جس کے پاس جو لکھا ہوا قرآن ہے، وہ اس کو لے آئے۔ چناں چہ مسجد نبوی میں مکتوب اجزا کا ایک ڈھیر اکھٹا ہو گیا۔ زید بن ثابت خود پورے قرآن کے حافظ تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کا اصول اختیار کرتے ہوئے یہ کیا کہ صحابہ سے قرآن کے مختلف اجزا سنتے اور اس کی تصدیق مکتوبات سے کرتے۔

اِس طرح انھوں نے اِس معاملے میں وہ طریقہ اختیار کیا جس کو ڈاکٹر موریس بکائی (وفات: 1998) نے ڈبل چیکنگ سسٹم (double checking system) کہا ہے، یعنی یادداشت کی مطابقت لکھے ہوئے سے کرنا اور لکھے ہوئے کو یادداشت سے جانچنا۔ اِس طریقے کو اختیار کرتے ہوئے انھوں نے پورا قرآن مرتب کیا، یہ قرآن غالباً قدیم طرز کے کاغذ پر لکھا گیا تھا، جس کو قرطاس (papyrus) کہا جاتا تھا۔ کتابت کی تکمیل کے بعد اِن اوراق کی جِلد بنائی گئی۔ یہ جلد چوکور (square) کی صورت میں تھی، اِس لیے اس کا نام رَبعہ رکھا گیا، یعنی چوکور سائز کی کتاب۔ اِس ربعہ کو ایک مستند نسخہ کے طور پر زوجہ رسول حفصہ بنت عمر کے گھر رکھوا دیا گیا۔ اِس ربعہ کی تیاری کے لیے قرآن کے جو متفرق اجزا اکھٹا کیے گئے تھے، اُن کا ایک ڈھیر مسجد نبوی میں موجود تھا۔ صحابہ کے مشورے سے

اِس پورے ڈھیر کو اُس کے مالکان کو واپس نہیں کیا گیا، بلکہ اُن سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد تیسرے خلیفہ عثمان بن عفّان کا زمانہ آیا۔ اُس وقت بہت سے صحابہ نے بطور خود لکھ کر پورے قرآن کا مجموعہ تیار کرلیا تھا۔ یہ مجموعے بھی غالباً قدیم کاغذ پر لکھے گئے تھے۔ لیکن اِن مجموعوں میں کئی قسم کے فرق پائے جاتے تھے۔ اِس بنا پر، قرأتِ قرآن کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گئے۔ کوئی شخص ایک انداز سے قرآن کو پڑھتا، اور کوئی شخص دوسرے انداز سے۔ خلیفہ سوم نے اُس وقت ایسا کیا کہ خلیفہ اول کے زمانے میں قرآن کا جو مستند نسخہ حضرت حفصہ کے گھر پر رکھا گیا تھا، اُس کو منگوایا اور کتابت کے ماہرین کی مدد سے اس کی بہت سی نقلیں تیار کروائیں۔ قرآن کے یہ نسخے بھی غالباً قدیم طرز کے کاغذ پر لکھے گئے تھے۔ پھر خلیفہ سوم نے قرآن کے اِن مجلد نسخوں کو مسلم ممالک کے مختلف مرکزی شہروں میں بھیج دیا، جہاں اُن کو شہر کی جامع مسجدوں میں رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ اب جو شخص قرآن کی نقل تیار کرے، وہ اِسی مستند نسخے سے قرآن کی نقل تیار کرے۔

حضرت عثمان نے جب قرآن کے یہ مستند نسخے تیار کرائے تو اُس وقت دوبارہ یہ حالت تھی کہ بہت سے لوگوں کے پاس قرآن کے ایسے نسخے تھے جس کو انھوں نے بطور خود تیار کیا تھا۔ اِن نسخوں میں فرق پایا جاتا تھا۔ اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے خلیفہ سوم نے یہ کیا کہ انھوں نے تمام غیر سرکاری نسخوں کو اکھٹا کروایا اور پھر اُن کو صحابہ کی موجودگی میں جلا کر ختم کر دیا۔ اِس طرح قرآن کے نسخے عہدِ صحابہ میں دو بار جلائے گئے — پہلی بار، خلیفہ اول کے زمانے میں قرآن کے متفرق اجزا جلائے گئے تھے۔ دوسری بار، خلیفہ سوم کے زمانے میں قرآن کی جلدیں صحابہ کے اتفاق رائے سے جلائی گئیں۔ اِس معاملے کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو: تفسير الجامع لأحكام القرآن للقرطبي کا دیباچہ (خطبة الكتاب)۔

اسلام کے دور اول میں خود صحابہ کے زمانے میں ایسا کیوں ہوا کہ قرآن کے اجزا، یا اس کے نسخے جلا کر ختم کر دئے گئے۔ اِس کا ایک معلوم سبب تھا۔ اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں کتابت کا جو طریقہ رائج تھا، اُس میں نقطہ اور اعراب (pronouncement) نہیں ہوا کرتا تھا۔ جو اہلِ زبان تھے، وہ تو

ایسی عبارت کو نقطہ اور اعراب کے بغیر صحیح طور پر پڑھ لیتے تھے، جس طرح ایک شخص جس کی مادری زبان اردو ہو، وہ اردو کی موجودہ کتابوں کو درست طور پر پڑھ لے گا جن میں اعراب موجود نہیں ہوتا۔

اسلام جب تک اہلِ عرب تک محدود تھا، اُس وقت تک اِس قسم کی تحریر کو پڑھنے میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا تھا۔ لیکن جب اسلام عرب کے باہر مختلف ملکوں میں پھیلا تو یہ مسئلہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا۔ اُس وقت قرآن کے جو نسخے ہوتے تھے، وہ نقطہ اور اعراب کے بغیر ہوتے تھے۔ غیر عرب لوگ حروف شناسی کے ذریعے عبارت کو پڑھنا سیکھ لیتے تھے، لیکن تلفظ کے معاملے میں وہ شدید غلطیاں کرتے تھے۔ اِس غلطی کا ایک سبب یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل عربی حروف کا تلفظ مختلف انداز سے کرتے تھے۔ مثلاً عرب کا قبیلہ قیس 'ك' کی آواز کو 'ش' کی صورت میں نکالتا تھا۔ چناں چہ وہ قرآن کی آیت: جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (19:24) کو اِس طرح پڑھنے لگا: جَعَلَ رَبُّشِ تَحْتَشِ سَرِيًّا۔ اِسی طرح قبیلہ تمیم 'س' کی آواز کو 'ت' کی صورت میں ادا کرتا تھا۔ مثلاً وہ قرآن کی آیت: قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ کو قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاتِ کی صورت میں پڑھتا تھا۔

نقطہ اور اعراب کا مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین تھا۔ کیوں کہ غیر منقوط اور غیر معرب الفاظ کو مختلف صورتوں میں پڑھا جا سکتا تھا، نقطہ اور اعراب کے بغیر اس کا تعین سخت مشکل تھا۔ مثال کے طور پر قرآن کی پہلی سورہ میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی آیت ہے۔ اِس آیت میں مَالِك کا لفظ اگر نقطہ اور اعراب کے بغیر ہو تو اس کو کم از کم پانچ صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلا: مٰلِكْ، مَلَكْ، مَلِكْ، مُلْك، مِلْك۔

خلافتِ راشدہ کے آخری زمانے تک یہ حال تھا کہ لوگوں نے قرآن کے نسخے لکھ کر بڑی تعداد میں تیار کر لئے تھے، لیکن یہ تمام نسخے نقطہ اور اعراب کے بغیر تھے۔ چناں چہ لوگوں کے درمیان قرآن کی قرأت میں بہت زیادہ اختلافات پیدا ہو گئے، یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے شخص کی تکفیر اور تفسیق کرنے لگا۔ یہ مسئلہ بے حد سنگین صورت اختیار کر گیا، حتی کہ امت کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا۔ اُس وقت اموی خلیفہ عبد المالک بن مروان (وفات: 705ء) نے اپنے گورنر حجاج بن یوسف الثقفی (وفات: 714ء) کو حکم دیا کہ وہ اِس مسئلے کا مستقل حل تلاش کرے۔ حجاج نے علما اور ماہرین کے

مشورے سے یہ طے کیا کہ قرآن کی آیتوں کو نقطہ اور اعراب کے ساتھ لکھا جائے۔ موجودہ زمانے میں جو قرآن ہر جگہ پایا جاتا ہے، وہ حجاج کے زمانے کے اِسی منقوط اور معرب قرآن کی نقل ہے۔

اِس کے بعد ایک اور مسئلہ باقی تھا، وہ اسلوبِ کتابت کا مسئلہ تھا۔ قدیم کتابت میں وہ حسن موجود نہ تھا جو آج کے نسخوں میں نظر آتا ہے۔ مختلف ماہرین نے اِس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار مشہور خطاط ابوعلی محمد بن علی بن مُقلہ (وفات: 940ء) نے وہ خوب صورت خط ایجاد کیا جس کے مطابق، بعد کو قرآن لکھا جانے لگا۔ موجودہ قرآنی خط ابن مقلہ کے اِسی خط کی مزید ترقی یافتہ شکل ہے۔ قدیم عربی خط کو خطِ کوفی کہا جاتا ہے اور ابن مقلہ کے خط کو خطِ نسخ۔

اِس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو ابتدائی زمانے میں قرآن کے ساتھ پیش آئیں۔ اِن کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود قرآن کے ساتھ بھی تقریباً اُسی قسم کے معاملات پیش آئے ہیں جو حدیث کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ اہلِ قرآن، حدیث کی جن باتوں کو لے کر حدیث کو مشتبہ ثابت کرتے ہیں، اُسی طرح مستشرقین (orientalists) قرآن کے بارے میں ایسا کرتے ہیں کہ وہ ابتدائی زمانے میں پیش آنے والی باتوں کو لے کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن ایک مشتبہ کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں، کسی آدمی کے لیے دو میں سے ایک کا آپشن ہے۔ وہ یا تو قرآن اور حدیث دونوں کے استناد کو مانے، یا دونوں کے استناد کا انکار کردے۔ کیوں کہ جن باتوں کو لے کر وہ حدیث کا انکار کرے گا، تقریباً وہی باتیں قرآن کے لیے بھی موجود ہوں گی۔

قرآن اور حدیث کا معاملہ

قرآن اور حدیث کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، وہ براہِ راست طور پر پوری انسانیت سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے بغیر خالق کے تخلیقی پلان کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ ایک لفظ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآن تخلیقی منصوبے کا خدائی بیان (divine statement of the creation plan) ہے اور سنت ربانی حیات کا زندہ مظاہرہ (living demonstration of divine life)۔ قرآن اور حدیث کو اِس سے کم سمجھنا، قرآن اور حدیث کی بھی تصغیر ہے اور نعوذ باللہ، خدا کی تصغیر بھی۔

اللہ تعالی نے جب انسان (آدم) کو پیدا کیا تو آغاز ہی میں اس کو جنت میں بسا دیا۔ اللہ تعالی نے انسانِ اول سے کہا: تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو۔ اور اس درخت کے قریب مت جانا، ورنہ تم ظالموں میں سے ہوجاؤ گے (2:35)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے جب انسان کو پیدا کیا تو آغاز ہی میں اُس کو جنت میں بسا دیا۔ گویا کہ ابتدائی طور پر جنت، انسان کو عمومی بنیاد (general basis) پر دی گئی تھی، یعنی سارے عورت اور مرد جنت میں قیام کریں اور خدا کی حمد کرتے ہوئے اُسی سے انجوائے (enjoy) کریں۔ لیکن انسان مطلوب معیار پر پورا نہیں اترا، اِس لیے اس کو جنت سے نکال کر موجودہ زمین پر بسا دیا گیا اور خدا کا یہ فیصلہ ہوا کہ اب جنت، انسان کو انتخابی بنیاد (selective basis) پر دی جائے گی، یعنی صرف اُن لوگوں کو جو قول و عمل سے اپنے آپ کو جنت کا مستحق ثابت کریں۔

انسان کے بارے میں اِس تخلیقی نظام کو بتانے کے لیے اللہ تعالی نے یہ کیا کہ ایک طرف اُس کو قرآن کی شکل میں ایک مستند ہدایت نامہ دے دیا، اور دوسری طرف، سنتِ رسول کی شکل میں اس کے لیے ایک عملی نمونے کا انتظام فرما دیا۔ خدا کے منصوبے کو سمجھنے کے لیے دونوں چیزیں یکساں طور پر ضروری ہیں، کیوں کہ قرآن میں صرف بنیادی چیزوں کا ذکر ہے۔ اور جہاں تک تفصیلی باتوں کا تعلق ہے، وہ صرف سنتِ رسول میں پائی جاتی ہے۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ قرآن کی سورہ البلد میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو مشقت (toil) میں پیدا کیا (90:4)۔ قرآن کی اِس آیت میں ایک عالمی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو اِس دنیا میں کہیں نہ کہیں مصیبت (suffering) کا تجربہ پیش آتا ہے۔ اِس واقعے کو لے کر پوری تاریخ میں تمام لوگ منفی سوچ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی میں یہ مصیبتیں کیوں پیش آتی ہیں، حتی کہ بہت سے لوگ اِس واقعے کو خدا کے وجود کے خلاف سب سے بڑی دلیل سمجھتے ہیں۔ مگر حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی مصیبت (suffering) اپنے اندر ایک عظیم مثبت پہلو رکھتی ہے۔ یہ مصیبت دراصل زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کا معاملہ ہے۔

زندگی کی مصیبت قابلِ شکر ہے، نہ کہ قابلِ شکایت۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الله إذا أحب قوماً ابتلاهم (سنن الترمذي، رقم الحديث: 2396) یعنی اللہ جن لوگوں سے محبت کرتا ہے، اُن کو آزمائش (مصیبت) میں ڈال دیتا ہے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت کا معاملہ جو انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ اُس کے لیے خدا کی رحمت ہوتا ہے، وہ اس کا تزکیہ کرکے اس کو جنت کا مستحق بناتا ہے، مصیبت آدمی کی سرکشی کو ختم کرتی ہے، مصیبت آدمی کے اندر گہری فکر پیدا کرتی ہے، مصیبت آدمی کو کٹ ٹو سائز (cut to size) بناتی ہے، مصیبت آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج پیدا کرتی ہے، مصیبت آدمی کے اندر احتساب (introspection) کی کیفیت کو جگاتی ہے، مصیبت آدمی کے اندر خدا کی یاد پیدا کرتی ہے، مصیبت آدمی کو فرشتوں کا ہم نشیں بناتی ہے، وغیرہ۔

اِس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو ہم کو حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ حدیث کا فائدہ صرف یہ نہیں ہے کہ اُس سے پانچ وقت کی نماز کا علم حاصل ہوتا ہے، یا کچھ شرعی احکام معلوم ہوتے ہیں۔ حدیث کا فائدہ اِس سے بہت زیادہ ہے۔ حدیث آدمی کی معرفت کو بڑھاتی ہے، حدیث آدمی کے لیے تزکیہ کا ذریعہ بنتی ہے، حدیث آدمی کی بصیرت میں اضافہ کرتی ہے، حدیث کسی آدمی کو قرآن فہمی کے قابل بناتی ہے، حدیث آدمی کے لیے ربانی تربیت کا ذریعہ ہے، وغیرہ۔

حفاظتِ حدیث کا اہتمام

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر عباسی دور تک کا جو زمانہ ہے، اس کی تاریخ مکمل طور پر موجود ہے۔ اِس سلسلے میں عربی کتابوں کے مطالعے سے پورے معاملے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دورِ اول کے اہلِ ایمان نے حفاظتِ حدیث کا بھی وہی اہتمام کیا جو انھوں نے حفاظتِ قرآن کے سلسلے میں کیا تھا۔ اِس اعتبار سے، دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں کے بارے میں ایسا کیا گیا کہ ایک طرف ان کو لکھا جاتا رہا اور دوسری طرف اُن کو حافظے میں محفوظ کرلیا گیا۔

یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں پرنٹنگ پریس کا زمانہ آیا اور قرآن اور حدیث دونوں کے ذخیرے کو طباعت کے ذریعے آخری طور پر محفوظ کر دیا گیا۔

اِس سلسلے میں یہ صرف ایک غلط فہمی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت کی تھی کہ قرآن کو لکھا جائے اور حدیث کو نہ لکھا جائے۔ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ دورِ اوّل کے علما اور محدثین نے صحابہ کے درمیان بکھری ہوئی حدیثوں کو غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے اکٹھا کیا۔ رجالِ حدیث اور متونِ حدیث کی تحقیق کے لیے نئے علوم وضع کیے۔ کامل چھان بین (scrutiny) کے بعد انھوں نے مستند احادیث کے مجموعے تیار کیے اور غیر مستند روایتوں کو الگ کر دیا۔ مسند امام احمد بن حنبل جس کو حدیث کا انسائیکلو پیڈیا سمجھا جاتا ہے، اُس میں تیس ہزار روایتیں موجود ہیں۔ بقیہ روایتوں کو ملا کر احادیث رسول کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہو جاتی ہے۔ پچھلے ادوار میں یہ حدیثیں کتابوں کی شکل میں ہوتی تھیں۔ اب کمپیوٹر کے دور میں حدیثوں کے اِس ذخیرے کو انٹرنیٹ پر ڈال دیا گیا ہے۔

احادیث کی تنقیح کا یہ کام ہزار سال سے جاری تھا۔ ہر دور میں علما تاریخی معلومات کی روشنی میں دوبارہ احادیث کے مجموعے کا جائزہ لیتے رہے، شخصی طور پر بھی اور ادارے کے طور پر بھی۔ موجودہ زمانے میں مشہور عرب محدث شیخ محمد ناصر الدین الالبانی (وفات: 1999) نے پورے ذخیرۂ حدیث کا ازسرِ نو جائزہ لیا اور لمبے مطالعہ اور تحقیق کے بعد 21 ضخیم مجلّدات تیار کیے۔ انھوں نے خالص علمی تحقیق کے بعد مستند روایتوں کو غیر مستند روایتوں سے الگ کر دیا اور دونوں کو جدید طباعتی معیار پر شائع کر دیا۔ اِس مجموعے کی 7 جلدیں مستند احادیث پر مشتمل ہیں اور اُن کا نام یہ ہے: سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها۔ اِس مجموعے کی 14 جلدیں غیر مستند روایتوں پر مشتمل ہیں اور اُن کا نام یہ ہے: سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة. یہ پورا مجموعہ انٹرنیٹ (www.waqfeya.com) پر موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حفاظت اور تدوین کے اعتبار سے، علماء امت نے قرآن اور حدیث دونوں کے لیے یکساں طور پر کام کیا ہے، حتی کہ دور طباعت سے پہلے حدیث کے حُفّاظ بھی اُسی طرح ہوتے تھے

جس طرح قرآن کے حفاظ ہوتے ہیں۔ اِس اعتبار سے، دونوں کے درمیان اصلاً جو واحد فرق ہے، وہ یہ کہ قرآن کے غیر مستند ذخیرے کو جلا کر ختم کر دیا گیا اور صرف مستند مجموعہ کو باقی رکھا گیا۔ جب کہ حدیث کے معاملے میں یہ ہوا کہ ان کی تنقیح کا کام تو پوری طرح کیا گیا، لیکن غیر مستند روایتوں کو کتابوں میں باقی رکھا گیا، اُن کو جلا کر ختم نہیں کیا گیا۔

لیکن اِس فرق کی بنا پر دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق واضح نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جو چیز علمی معیار پر غیر مستند ثابت ہوجائے، وہ اہلِ علم کے لیے عملاً بھی غیر مستند ثابت ہوجاتی ہے، خواہ وہ کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہو یا موجود نہ ہو۔ علوم کی تاریخ میں اِس نوعیت کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر شمسی نظام (solar system) کو لیجئے۔ کوپرنکس (Nicolaus Copernicus) اور گلیلیو (Galileo Galilei) کی تحقیقات کے بعد آفتاب مرکزی ماڈل (heliocentric model) کو ایک مسلمہ کے طور پر مان لیا گیا ہے، جب کہ اِس سے پہلے اِس معاملے میں لمبی مدت تک زمین مرکزی ماڈل (geocentric model) کو درست تسلیم کیا جاتا تھا۔

اگر آپ لائبریری اور میوزیم کا جائزہ لیں تو آپ پائیں گے کہ زمین مرکزی ماڈل کی بنیاد پر تیار کیا جانے والا لٹریچر اب بھی ہر جگہ موجود ہے، اس کو جلا کر ختم نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود آج کی دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں کرتا کہ وہ قدیم لٹریچر کو لے کر زمین مرکزی ماڈل کی صحت کا دعوی کرے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اِسی اصول کو وہ حدیث کے معاملے میں بھی اختیار کریں۔ مستند حدیثوں کے علاوہ، وہ دوسری روایتوں کو غیر معتبر مان کر رد کر دیں۔ وہ اِن غیر معتبر روایتوں کی تحریری موجودگی کو اُسی طرح عذر نہ بنائیں جس طرح وہ زمین مرکزی ماڈل کی تحریری موجودگی کو عذر نہیں بناتے۔

کتابتِ حدیث کا مسئلہ

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں، مسند احمد، صحیح مسلم، الدارمی میں آئی ہے۔ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں: عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تكتبوا عنّي، ومن كتب عنّي غير القرآن فليمحه، وحدّثوا عنّي ولا حرج، ومن كذب علي، قال

همام: أحسبه قال متعمّدا، فليتبوّأ مقعده من النار (صحيح مسلم، رقم الحديث: 5326) یعنی ابوسعید الخدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے نہ لکھو (قرآن کے سوا)، اور جس نے لکھا مجھ سے قرآن کے سوا، وہ اُس کو مٹادے۔ اور میری باتوں (حدیثوں) کو بیان کرو، اِس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا، راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ فرمایا کہ جس نے جان بوجھ کر جھوٹ باندھا، تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔

امام نووی نے اِس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ایک قول اِن الفاظ میں نقل کیا ہے: إنما نهى عن كتابة الحديث مع القرآن في صحيفة واحدة، لئلاّ يختلط فيشتبه على القاري في صحيفة واحدة (صحيح مسلم بشرح النّووي، جلد 18، صفحہ 130) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا، اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی صحیفہ میں قرآن کے ساتھ حدیث کو لکھنے سے منع فرمایا، تاکہ دونوں مل نہ جائیں اور ایک صحیفہ میں ہونے کی وجہ سے قاری کو اشتباہ نہ پیش آئے۔

اِس تشریح سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کتابتِ حدیث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت مطلق معنوں میں نہ تھی۔ وہ صرف اِس معنی میں تھی کہ قرآن اور حدیث دونوں کو ایک ہی کاغذ یا ایک ہی صحیفہ میں ساتھ ساتھ نہ لکھو۔ کیوں کہ اِس صورت میں یہ اندیشہ تھا کہ قاری کو اشتباہ پیش آجائے اور وہ قرآن اور حدیث دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے نہ دیکھ سکے۔ گویا کہ یہ ممانعت مشروط تھی، نہ کہ مطلق۔ یہ دراصل احتیاط کا ایک معاملہ تھا۔ کیوں کہ پچھلے اہلِ کتاب کے یہاں ایسا ہو چکا تھا کہ اُن کے علما اپنے پیغمبر کی بات کو وحی کے ساتھ ملا کر لکھ دیتے تھے۔ اِس طرح اُن کے یہاں ایسا ہوا کہ خدا کا کلام اپنی اصل صورت میں محفوظ نہ رہا، بلکہ وہ انسانی کلام کے ساتھ مختلط ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ حکم دراصل اِسی پس منظر میں تھا۔

چناں چہ صحابہ نے ایک ہی کاغذ یا ایک ہی صحیفہ پر قرآن اور حدیث دونوں کو ایک ساتھ لکھنا بند کر دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو وہ علاحدہ کاغذ یا صحیفہ میں بدستور لکھتے رہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد صحابہ نے الگ صحیفوں میں حدیثیں لکھ کر جمع کی تھیں۔ امام نووی نے اپنی شرح میں، صحابہ کے متعدد صحیفۂ احادیث کا ذکر کیا ہے۔ یہ صحیفے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھے گئے تھے جو منتخب احادیث پر مشتمل تھے۔ اِن میں سے ایک صحیفہ وہ ہے جو علی بن ابی طالب نے تیار کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ کے حسب ذیل قول سے بھی یہ ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں صحابہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص حدیث لکھتے تھے، جب کہ میں نہیں لکھتا تھا: أن عبد الله بن عمرو كان يكتب، ولا أكتب. (شرح النووي، جلد 18، صفحہ: 130)

اِس معاملے میں ہمّام بن منبّہ (وفات: 749ء) کا حوالہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہمام بن منبہ ایک تابعی ہیں۔ انھوں نے صحابی رسول، حضرت ابو ہریرہ (وفات: 678ء) کی صحبت اختیار کی اور اُن سے حدیثیں لے کر صحیفہ کی صورت میں لکھتے رہے۔ امام احمد بن حنبل (وفات: 855ء) کی مسند (جلد 2، صفحات: 319-212) میں یہ صحیفہ مکمل طور پر موجود ہے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ مخطوطہ کی صورت میں بعض کتب خانوں میں موجود تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (وفات: 2002) نے اس کو ایڈٹ کر کے شائع کر دیا ہے۔ اِس صحیفہ میں 140 روایتیں ہیں۔

قولی تواتر، عملی تواتر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنت کے دو حصے ہیں — قولی تواتر، اور عملی تواتر۔ قولی تواتر سے مراد پیغمبر اسلام کی سنت کا وہ حصہ ہے جو لفظی روایت کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اس لفظی روایت میں چوں کہ راویوں کا نسل در نسل تسلسل پایا جاتا ہے، اِس لیے اس کو قولی تواتر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، سنت کا جو حصہ عمل سے تعلق رکھتا ہے، وہ بھی راویوں کے مسلسل عمل کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، اِس لیے اُس کو عملی تواتر کہا جاتا ہے۔

قولی تواتر کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے، یہ ذریعہ حدیث کی کتابیں ہیں۔ محدثین جو کہ زیادہ تر تابعین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے یہ کیا کہ جو روایتیں صحابہ اور تابعین کے ذریعے

چلی آرہی تھیں، اُن کو جمع کیا، پھر اُن کو چھانٹ کر مستند روایتوں اور غیر مستند روایتوں کو الگ کیا اور پھر مستند روایتوں کو راویوں کے نام کی تصریح کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں قلم بند کر دیا۔ حدیث کی یہ کتابیں پہلے ہاتھ سے لکھے ہوئے قلمی نسخوں (manuscripts) کی صورت میں تھیں، اب وہ چھپ کر عمومی طور پر ہر ایک کے لیے قابلِ حصول ہوگئی ہیں۔

عملی تواتر کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے، عملی تواتر کو جاننے کے دو ذرائع ہیں — حدیث کی کتابیں، اور اسلامی ادارے (Islamic institutions)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا کہ ایک طرف آپ نے قولی طور پر نماز کا حکم بتایا اور دوسری طرف، آپ نے فرمایا: صلّوا کما رأیتمونی أصلی (صحیح الجامع للألباني، رقم الحدیث: 893) یعنی جس طرح تم نے مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اُسی طرح تم نماز پڑھو۔ اِسی طرح آپ نے قولی طور پر حج کا حکم بتایا اور اِسی کے ساتھ آپ نے فرمایا: خُذوا عني مناسککم (مسند أحمد، رقم الحدیث: 3548) یعنی جس طرح تم نے مجھ کو حج کرتے ہوئے دیکھا، اُسی طرح تم حج ادا کرو۔

دین کو جاننے کا یہ دوطرفہ طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پایا جاتا تھا، وہی دوطرفہ طریقہ بعد کو بھی مسلسل طور پر جاری رہا، یعنی احکامِ دین کو قولی اعتبار سے، حدیث کی کتابوں کے ذریعہ جاننا، اور احکامِ دین کے عملی پہلو کو قائم شدہ اداروں (established institutions) کے ذریعے جاننا۔ مثلاً نماز کا قولی حکم حدیث میں تواتر کی صورت میں موجود ہے، اور اس کی عملی صورت مساجد میں قائم شدہ نمازِ باجماعت کی صورت میں۔ اِس طرح مسجد کا ادارہ نماز کے عملی تواتر کو بتانے کا ذریعہ ہے۔ اِسی طرح رمضان کے مہینے میں روزے کا حکم حدیث میں تواتر کی صورت میں موجود ہے۔ امت کا اجتماعی طور پر روزہ رکھنا، روزے کے حق میں عملی تواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ اِسی طرح حج کا حکم قولی طور پر حدیث میں موجود ہے اور ہر سال ذی الحجہ کے مہینے میں لاکھوں مسلمان مکہ میں جمع ہو کر مناسکِ حج ادا کرتے ہیں۔ یہ حج کے عملی تواتر کو جاننے کا ذریعہ ہے، وغیرہ۔

واضح ہو کہ جہاں تک اثباتِ حکم کا تعلق ہے، اس کا اصل ذریعہ قول ہے، یعنی کوئی چیز جب تک

قول کے ذریعے ثابت نہ ہو، اس کو حکمِ شرعی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ کوئی حکم جب قول کے ذریعے ثابت ہوجائے تو اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اس کی عملی صورت کیا ہے۔ دینی احکام کے معاملے میں عملی تواتر کی حیثیت یہی ہے۔ اِس معاملے میں برعکس صورت اختیار نہیں کی جاسکتی، یعنی پہلے عمل کو حکمِ شرعی کا درجہ دیا جائے اور پھر اس کے بعد اس کی تائید کے لیے قول تلاش کیا جائے۔

قرآن اور سنتِ متواترہ

قرآن اور سنت متواترہ کی حیثیت کیا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی (وفات: 1997) نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے مقدمے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات (صلوۃ، زکوۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا، مروہ، سعی، طواف، وغیرہ) کا مفہوم بیان کرنے کا حق صرف صاحب وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے۔ آپ جس طرح اس کتاب کے لانے والے تھے، اسی طرح آپ اس کے معلّم اور مبیّن بھی تھے۔ اور یہ تعلیم وتبیین آپ کے فریضۂ رسالت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کس طرح معلوم ہو کہ فلاں اصطلاح کا یہ مطلب خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ سو جہاں تک معروف دینی اصطلاحات کا تعلّق ہے، یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اِس لیے کہ اِس قسم کی ساری اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنتِ متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سنتِ متواترہ بعینہٖ اُنھی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن سے قرآن مجید ثابت ہے۔ اُمّت کے جس تواتر نے قرآن کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے، اُسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے اور دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اِس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اُس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہے۔ ان کی صورت میں اگر کوئی جزئی قسم کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

پانچ وقت کی نمازیں سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں اور اُسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ وہ قرآن کو جانتے اور مانتے ہیں۔ رہا بعض جزئی امور میں کوئی فرق تو یہ فرق کوئی اہمیت رکھنے والی شے نہیں ہے۔ اِس طرح کے معاملات میں دلائل کی روشنی میں جس پہلو پر بھی جس کا اطمینان ہو، اس کو اختیار کرسکتا ہے۔

منکرینِ حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ اور عمرہ وقربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور امّت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے، اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق، ترمیم وتغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے۔ اِس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے، اُسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔

اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بالکل ایک غلط چیز ہے۔ صوم وصلوٰۃ کا لغت میں جو مفہوم بھی ہو، لیکن دین میں ان کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو شارع نے واضح فرمایا ہے۔ اِن دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہی اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اِسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان سے جو اعمال متعلق ہیں، تواتر وتوارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو معمولی جزئی اختلافات ہیں، وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں..... جو نماز مطلوب ہے، وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں۔ ہر چند کہ اس کی صورت وہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اِس قسم کی چیزوں میں زیادہ کھوج کرید کرتے ہیں، وہ اُس دینِ قیم کے مزاج سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآن مجید نے دی ہے..... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے، جن کی پوری حدود تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امّت متفق ہے، اتنے پر قناعت کرو..... ورنہ خود بھی شک میں پڑو گے

اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور تمھارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔'' (صفحہ:13)

قرآن اور حدیث

دینِ اسلام کے دو ماخذ (sources) ہیں — قرآن اور حدیث۔ قرآن، خدا کا کلام ہے اور حدیث، رسول خدا کا کلام۔ قرآن وحی پر مبنی ہے اور حدیث، الہام (inspiration) پر مبنی۔ دونوں ہی مستند ہیں، اِس فرق کے ساتھ کہ ایک لفظی ہے اور دوسرا معنوی۔ قرآن ڈائرکٹ طور پر خدا کا کلام (word of God) ہے، اور حدیث انڈائرکٹ طور پر خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کا کلام ہے۔ علما عام طور پر، قرآن کو وحیِ متلو کہتے ہیں، اور حدیث کو وحیِ غیر متلو۔ قرآن اور حدیث میں ظاہری نسبت کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن استناد (authenticity) کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اول میں اتارا گیا۔ یہ زمانہ پرنٹنگ پریس کے وجود میں آنے سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اُس زمانے میں کلام کو محفوظ کرنے کا اصل ذریعہ حافظہ (memory) ہوا کرتا تھا۔ کثرتِ استعمال کی بنا پر اس زمانے کے لوگوں کا حافظہ عام طور پر بہت زیادہ قوی ہوتا تھا، نہ صرف عربوں کا بلکہ ساری دنیا کا۔ اس زمانے کے جو کلام مختلف زبانوں میں آج ہمارے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مثلاً عرب کے اشعار کا مجموعہ (جمهرة أشعار العرب) اور قدیم عرب کے خطبے (جمهرة خُطب العرب) کے مجموعے جو آج مطبوعہ شکل میں پائے جاتے ہیں، وہ ابتداءً انسانی حافظے میں تھے اور پھر بعد کو انھیں لکھا گیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ قدیم زمانے میں کلام کی حفاظت کا اصل ذریعہ انسانی حافظہ ہوا کرتا تھا۔ اور کتابت (writing) کی حیثیت اضافی (additional) ہوتی تھی۔ اِس قدیم رواج کے مطابق، قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت (preservation) کا عام ذریعہ یکساں طور پر انسانی حافظہ تھا۔ قوی الحافظہ ہونے کی بنا پر ایسا ہوتا تھا کہ چاہے قرن کی آیات ہوں یا رسولِ خدا کا کلام، دونوں سنتے ہی لوگوں کے حافظے میں پوری طرح محفوظ ہو جاتے تھے۔ یہ حفاظت اتنی زیادہ قوی تھی کہ قدیم زمانے میں لوگوں کو ان پر حفاظت کے نقطۂ نظر سے کبھی شبہہ نہیں ہوا۔

قرآن میں یہ حکم تھا کہ رسول سے جو کچھ تم کو ملے، تم اس کی پیروی کرو اور جس سے رسول تم کو روکے، اُس سے تم رک جاؤ (59:7)۔ اِس بنا پر لوگوں نے قرآن کی حفاظت کا جس طرح اہتمام کیا، ٹھیک اُسی طرح انھوں نے کلامِ رسول کی حفاظت کا بھی اہتمام کیا۔ وہ جس طرح قرآن کی آیتوں کو دوسروں کو سناتے تھے، اِسی طرح وہ دوسروں سے برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا بھی چرچا کرتے تھے۔ یہ چرچا نہ صرف دعوت اور تربیت کے لئے اہم تھا، بلکہ اِس تکرار کی بنا پر وہ لوگوں کی یادداشت میں برابر پختہ ہوتا رہتا تھا۔

قدیم زمانے کی کتبِ سماوی جو بعد کو محفوظ نہیں رہیں، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ لکھی نہیں گئیں۔ قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کو لکھی ہوئی تختیاں (7:145) دی گئی تھیں۔ پچھلی کتب سماوی کے محفوظ نہ ہونے کا سبب اصلاً یہ تھا کہ پیغمبر کے بعد ان کی حفاظت کے لئے مضبوط ٹیم موجود نہ رہی، جو نسل در نسل اس کی حفاظت کی ضامن ہوتی۔

دورِ اول میں قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت کا یکساں طور پر اہتمام کیا گیا۔ حدیث کے بارے میں یہ ہوا کہ شروع میں آپ نے حدیث کو لکھنے سے منع فرمادیا (لا تکتبوا عنّي غیرَ القرآن) لیکن بعد کو آپ نے لوگوں سے یہ کہا کہ تم حدیث کو بھی لکھا کرو (قیّدوا العلم بالکتابة)۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شروع سے حافظہ کے علاوہ، کتابت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ قرآن کی حفاظت کے لئے ایک اضافی (additional) انتظام تھا، ورنہ قرآن بیش تر صحابہ کو یاد تھا اور وہ اس کو برابر مختلف صورتوں میں دہراتے رہتے تھے۔ مثلاً نماز میں اور دعوت کے موقع پر، وغیرہ۔ حفظِ قرآن کی یہ روایت بعد کو بھی تحفیظ القرآن کے مدرسوں کی صورت میں جاری رہی اور اب تک جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دورِ اول میں قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت کا اہتمام یکساں طور پر کیا گیا۔ دونوں کے درمیان فرق حفاظت (preservation) کا نہیں تھا، بلکہ وہ طریقِ حفاظت (method of preservation) کا فرق تھا۔ حدیث کو لکھنے کا کام خود دورِ اول میں شروع ہو چکا تھا۔ مختلف صحابہ نے اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے کچھ حدیثیں لکھی تھیں۔ ان میں سے حدیث کا

ایک بڑا مجموعہ وہ ہے جو صحیفہ ابن ابی ہمام کے نام سے مشہور ہے۔ ابو ہمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، ابو ہریرہ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے براہِ راست طور پر ابو ہریرہ سے حدیثیں سنیں، ان کو کاغذ پر لکھا۔ ان کا صحیفہ اب بھی برلن اور دمشق کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ تحریری صحیفہ اس بات کا ایک یقینی ثبوت ہے کہ حدیثیں لکھ کر محفوظ کی گئی تھیں۔

بعد کے زمانے میں قصّاص (story tellers) نے بہت سی حدیثیں وضع کیں اور ان کو عوام میں پھیلا دیا۔ یہ کام زیادہ تر عباسی خلافت کے زمانے میں ہوا۔ مگر اسی زمانے میں محدثین اور علما کی بڑی تعداد اٹھی۔ اس نے طویل سفر کر کے تمام احادیثِ رسول کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے رجالِ حدیث پر باقاعدہ کتابیں لکھیں اور خالص علمی اعتبار سے حدیث کا باقاعدہ فن بنایا اور پھر تمام حدیثوں کو چھانٹ کر مستند حدیثوں کو غیر مستند روایتوں سے الگ کر دیا۔ یہ کام خالص علمی سطح پر انجام پایا۔

مشہور محدث محمد ناصر الدین الالبانی نے دوبارہ تمام حدیثوں کا ازسرنو جائزہ لیا۔ یہ بلاتشبیہ اسی قسم کا ایک کام تھا جیسا کہ خلیفۂ اول کے زمانے میں زید بن ثابت الانصاری نے کیا تھا۔ انھوں نے اُس زمانے میں قرآن کے تمام لکھے ہوئے اجزا کا ازسرِ نو جائزہ لیا، اور پھر وہ مجموعۂ قرآن مرتب کیا جو مصحفِ عثمانی کے نام سے مشہور ہے۔ اِسی طرح محدث الالبانی نے تمام حدیثوں کا جائزہ لے کر دوبارہ مستند اور غیر مستند حدیثوں کو الگ کر دیا۔ اِس کام میں انھوں نے اپنی تقریباً پوری عمر صرف کر دی۔

اسوۂ حسنہ

قرآن کی سورہ الاحزاب میں یہ آیت آئی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)۔ اِس آیت میں اُسوہ کے معنی ماڈل (model) کے ہیں۔ قرآن کی اِس آیت سے حدیث کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ حدیث، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ریکارڈ ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا نقشہ حیات (life style) کیا تھا۔ حدیث یا نقشہ حیات کے ریکارڈ کا کام اس لیے ممکن ہوسکا کہ پیغمبر اسلام کے ساتھ قابلِ لحاظ تعداد میں ایک مضبوط ٹیم جمع ہوگئی۔ انھوں نے پیغمبر کے شب و روز کو دیکھا اور اس کو بعد کی نسلوں تک محفوظ طور پر پہنچایا۔ اصحابِ رسول کی

یہ ٹیم اگر موجود نہ ہوتی تو پیغمبر اور بعد کی نسلوں کے درمیان ایک بُعد (gap) پیدا ہوجاتا اور بعد کے لوگوں کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہ ہوتا کہ پیغمبر اسلام کا نقشہ حیات کیا تھا۔

حدیث سادہ طور پر صرف احکام کو معلوم کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ یہ حدیث کا ذخیرہ ہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ حیات کیا تھا۔ اِسی کا نام ماڈل ہے۔ حدیث کو الگ کرنے کے بعد یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا کہ پیغمبر اسلام کا ماڈل کیا تھا۔ قرآن سے دین کی صرف آئڈیالوجی معلوم ہوتی ہے، قرآن سے دین کا ماڈل معلوم کرنا ممکن نہیں۔

ماڈل کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ ماڈل کے بغیر اسلام کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کرنا ممکن نہیں۔ سیرتِ رسول کا ماڈل اگر موجود نہ ہو تو صرف قرآن کافی نہیں ہوسکتا۔ ماڈل کے بغیر قرآن صرف ایک مجرّد نظریہ (abstract ideology) بن جائے گا۔ لوگ اس کو پڑھیں گے، لیکن قرآن کے مطابق، اپنی عملی زندگی کی تشکیل ناممکن ہوجائے گی۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں بار بار یہ آیا ہے کہ اللہ کا ذکرِ کثیر (33:40) کرو۔ لیکن قرآن سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ذکرِ کثیر (اللہ کو زیادہ یاد کرنا) کی عملی صورت کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اِس کو گنتی کے معنی میں لیا اور اس کا نصاب بنایا، یعنی اتنے ہزار بار اللہ اللہ کرنا یا اتنے لاکھ بار اللہ اللہ کرنا۔ لیکن ذکر کثیر کا یہ مطلب نہیں۔ ذکرِ کثیر کا حقیقی مطلب حسب ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ کہتی ہیں کہ: كان النبي صلي الله عليه و سلم يذكر الله على كل أحيانه۔ اِس روایت میں 'حین' کا لفظ موقع (occasion) کے معنی میں ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع کو یا ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر اس کے حوالے سے اللہ کو یاد کرتے تھے۔ مثلاً چڑیا کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر اللہ کے تخلیقی کمال کو یاد کرنا، وغیرہ۔

پیغمبر کے فرائض

پیغمبر کے فرائض کو قرآن میں چار مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کی یہ آیت

معمولی لفظی فرق کے ساتھ چار مرتبہ آئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (62:2) یعنی وہی اللہ ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھیں میں سے اٹھایا۔ یہ رسول اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں پیغمبر کے چار کام بتائے گئے ہیں — تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تزکیہ، تعلیم حکمت۔ خدا کا نبی ہونے کی حیثیت سے پیغمبر کی جو ذمے داریاں ہیں، اُن سب کو اِن چار عنوانات کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کا مطالعہ کر کے پیغمبر کے پورے مشن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

1۔ پیغمبر کا پہلا کام تلاوتِ آیات ہے، یعنی وحی کے ذریعے ملے ہوئے کلامِ الٰہی کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچانا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام پوری طرح انجام دیا اور آج وہ قرآن کی صورت میں ایک محفوظ کتاب کے طور پر ہمارے پاس موجود ہے۔

2۔ پیغمبر کا دوسرا کام تعلیم کتاب ہے۔ تعلیم کتاب سے مراد تفسیر کتاب ہے، یعنی قرآن کی آیتوں کی شرح کرنا۔ اِس شرح کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، یہ کہ آیت کے مفہوم کی نظری وضاحت۔ دوسرے، یہ کہ آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے، اس پر عمل کر کے اس کا مستند عملی نمونہ قائم کرنا۔

3۔ پیغمبر کا تیسرا کام تزکیہ ہے۔ تزکیہ سے مراد دینی بنیاد پر افراد کی شخصیت کی تعمیر ہے۔ یہ کام پیغمبر نے روزمرہ کی صحبت کے ذریعے انجام دیا۔ پیغمبر نے تزکیہ کے اصول بھی بتائے اور واقعات کے حوالے سے اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔ حدیثِ رسول یا سنتِ رسول اِسی پیغمبرانہ عمل کا ریکارڈ ہے۔

4۔ پیغمبر کا چوتھا کام حکمت کی تعلیم ہے۔ حکمت سے مراد بصیرت (wisdom) ہے۔ یہ کام بھی پیغمبر نے روزمرہ کی صحبتوں کے درمیان انجام دیا۔ پیغمبر نے لوگوں کو بتایا کہ دینی زندگی یا دعوتی عمل کو انجام دینے کے لیے بصیرت کا تقاضا کیا ہے، وہ کون سی حکمت ہے جس کو اختیار کر کے ایک مومن اپنے فرائض کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔

انکارِ حدیث کا مسئلہ

امت کی بعد کی نسلوں میں فطری طور پر بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک قانونِ فطرت ہے، اِس میں کوئی استثنا نہیں۔ اِس معاملے میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امت کی بعد کی نسلوں میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بگاڑ کے وقت اصلاح کا صحیح اسلوب اختیار کیا گیا یا غلط اسلوب۔ بگاڑ کے وقت جو مصلحین یا مجددین اٹھتے ہیں، وہ اگر غلط اسلوب اختیار کریں تو خواہ اُن کی نیت درست ہو، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بگاڑ میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔ انکارِ حدیث کا ظاہرہ اِسی غلطی کا ایک نتیجہ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کو جس دین پر چھوڑا تھا، وہ امت کی پہلی نسل اور دوسری نسل (صحابہ اور تابعین) کے زمانے میں بڑی حد تک اپنی ابتدائی حالت پر باقی رہا۔ لیکن امت کی تیسری نسل میں واضح طور پر بگاڑ آ گیا۔ اصل دین سے انحراف کی صورتیں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگیں۔ اُس وقت مصلحین اور مجددین کو فطری طور پر تشویش پیدا ہوئی۔ وہ کوشش کرنے لگے کہ امت کو دوبارہ اُس دین پر قائم کریں جو پیغمبر اسلام نے اپنے قول وعمل کے ذریعہ پیش فرمایا تھا۔

اب اصلاح کے لیے ممکن طور پر دو اسلوب تھے — ایک، روایتی اسلوب اور دوسرا، عقلی اسلوب۔ روایتی اسلوب کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کے اعتقادی مسلّمہ کی بنیاد پر انھیں اصلاح کے لیے آمادہ کیا جائے۔ دوسرا اسلوب یہ تھا کہ لوگوں کو ان کے عقلی مسلّمہ کی بنیاد پر اصلاح کے لیے آمادہ کیا جائے۔ پہلے اسلوب کو مبنی بر روایت (tradition-based) اسلوب کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے اسلوب کو مبنی بر عقل (reason-based) اسلوب کہا جاسکتا ہے۔

اِس معاملے میں مبنی بر عقل اسلوب ہی درست اسلوب تھا۔ یہ وہی اسلوب تھا جس کو قرآن میں بار بار اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن بار بار انسان کی عقل کو خطاب کرتا ہے۔ عقل کو خطاب کرنے کا مطلب ہے — انسان کے اپنے مسلمہ پر اس کے ذہن کو ایڈریس کرنا۔ یہ اسلوب مؤثر بھی ہے اور اس کے ذریعے کوئی نئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ اسلوب تھا جس کے ذریعے سے اصحابِ رسول کا گروہ وجود میں آیا، یعنی امت کی پہلی نسل۔

لیکن قدیم دور کے مصلحین، خاص طور پر عباسی دور کے مصلحین نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے عقلی اسلوب کو اختیار نہیں کیا، بلکہ روایتی اسلوب کو بڑے پیمانے پر اختیار کرلیا۔ غالباً اِس لیے کہ اُس وقت بگاڑ کے باوجود پیغمبر کو امت کے اندر ایک مسلمہ شخصیت کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔ اور یہ امید کی جاسکتی تھی کہ پیغمبر کے حوالے سے جو بات کہی جائے گی، وہ امت کے افراد کے لیے لازمی طور پر قابلِ قبول ہوگی۔ یہ سوچ اصولاً درست تھی، لیکن عملی طور پر ابتدا ہی میں اس کے دو گروہ بن گئے — ایک، محدثین کا گروہ۔ اور دوسرا واضعینِ حدیث کا گروہ۔ محدثین نے بجا طور پر یہ کیا کہ انھوں نے علمِ حدیث کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے حدیث رسول سے استفادہ کرنے کے لیے پختہ علمی اصول وضع کیے۔ انھوں نے غیر معمولی محنت کے ذریعے صحیح احادیث کے مجموعے تیار کئے۔ اِس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ امت کے افراد، پیغمبر کے مستند اقوال اور اعمال کو جانیں اور اس پر عمل کریں۔

مگر اِسی کے ساتھ مصلحین کا ایک اور گروہ پیدا ہوا، جس کو واضعین حدیث کا گروہ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اُس غلطی کا شکار ہوئے جس کا ایک مظاہرہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوچکا تھا۔ اِس ظاہرے کو حضرت انس بن مالک کی ایک روایت میں كأنهم تقالّوها (صحيح البخاري، رقم الحديث: 5063) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی کچھ لوگوں نے عبادت کے معاملے میں پیغمبر اسلام کی سنت کو کم سمجھا اور بطور خود اس پر اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس مزاج کو ایک لفظ میں کم تر اندازہ کرنا (to underestimate) کہا جاسکتا ہے۔

اِسی غلط مزاج کی بنا پر عباسی دور کے مصلحین نے ترغیب اور تشویق کے لیے حدیثیں وضع کرنا شروع کیا۔ اِس کے بعد صوفیا نے بھی اِسی اسلوب کو اختیار کرلیا۔ انھوں نے تزکیہ کے لیے بطور خود نئے نئے طریقے وضع کئے۔ یہ اسلوب اتنا زیادہ پھیلا کہ بعد کو علما اور واعظین اور مبلغین کی اکثریت نے اپنی تقریر اور تحریر میں اس کو اختیار کرلیا، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ اگر واضعِ حدیث بن گئے تو دوسرے لوگ ناقلِ موضوعات۔

اِس روایت میں ”تقالّوها“ کا لفظ بہت اہم ہے۔ اِس کا مطلب ہے کسی چیز کو کم سمجھنا، اس کا

کم تر اندازہ (underestimation) کرنا۔ اصولی طور پر یہی مزاج ہے جو ہر قسم کی بدعات کا اصل سبب ہے۔ اپنے ذہن (mindset) کی بنا پر ایک آدمی قرآن اور حدیث کی تعلیم کو کم سمجھتا ہے اور بظاہر اچھی نیت سے اُس میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر دین کے معاملے میں اِس قسم کا اضافہ یقینی طور پر باطل ہے۔ کوئی بھی عذر اس کو جائز ٹھیرانے کے لیے کافی نہیں۔

حدیث کے الفاظ میں یہ سرتاسر جھوٹ (کذب) ہے۔ اِس سلسلے میں ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَن كذب علي فليتبوّأ مقعده من النار (صحيح البخاري، رقم الحديث: 107) یعنی جس نے میرے اوپر جھوٹ کہا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: من يقل علي ما لم أقل، فليتبوّأ مقعده من النار (صحيح البخاري، رقم الحديث: 109) یعنی جس نے میری طرف منسوب کرتے ہوئے وہ کہا جو میں نے نہیں کہا ہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

اِس قسم کی روایتیں جو احادیث کی کتابوں میں آئی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں نہایت واضح ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے صرف وہی بات کہی جاسکتی ہے جو آپ نے خود فرمایا ہو۔ کوئی ایسی بات جو آپ نے نہ کہی ہو، اس کو آپ کی طرف منسوب کرکے کہنا، یقینی طور پر ایک فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہت سے مصلحین اور صوفیا اور علما جنھوں نے بطور خود شریعت میں اضافے کئے ہیں اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، وہ اِس کے جواز میں کہتے ہیں کہ یہ کذب نہیں۔ اِس لیے کہ یہ رسول اللہ کی تائید میں ہے، نہ کہ آپ کی مخالفت میں (أنه كذب له، لا عليه)، یعنی دینی امور میں اِس قسم کا اضافہ، اضافہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ترغیب وتشویق ہے۔ مگر اس قسم کا کوئی بھی عذر اِس معاملے میں قابلِ قبول نہیں۔ دین میں اِس قسم کا اضافہ، خواہ وہ عمداً ہو یا سہواً، وہ عذر کے ساتھ ہو یا عذر کے بغیر، بظاہر وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر حال میں وہ فعل حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی شخص اپنی رائے کے طور پر کچھ بھی کہنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منسوب کرکے

کچھ کہنا، بلاشبہہ حرام ہے اور اللہ تعالی کے یہاں اس کی سخت پکڑ ہوگی۔(2009)

حدیثوں میں اختلاف کا مسئلہ

ایک شخص جب حدیث کا تفصیلی مطالعہ کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ حدیثوں میں کافی اختلاف ہے جو عام طور پر قرآن میں نظر نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر وہ الجھن میں پڑ جاتا ہے اور حدیث کی صحت کا انکار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کم فہمی کی بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں حدیث اس بات کا ریکارڈ ہے کہ ان غیر متغیر اصولوں کو روزانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح منطبق کیا گیا۔ عملی زندگی چوں کہ ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتی، اس لیے فطری طور پر انطباق میں فرق ہو جاتا ہے۔ حدیثوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، وہ دراصل اسی فطری فرق کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ وہ حکم کا اختلاف نہیں، بلکہ انطباق کا اختلاف ہے۔

مثال کے طور پر ہدیہ (gift) کے مسئلے کو لیجئے۔ ایک طرف بہت سی روایتیں ہیں جن میں ہدیہ اور تحفہ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے برعکس روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً موطا (باب ما جاء في المهاجرة) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے کو ہدیہ دو، اس سے باہمی محبت پیدا ہوگی اور عداوت جاتی رہے گی: تهادوا تحابوا وتذهب الشحناء (موطأ الإمام مالك، رقم الحديث: 1651)۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہدیہ اور تحفہ کے لین دین سے آپس میں انسیت اور محبت بڑھتی ہے۔ اسی طرح ہدیہ اور تحفہ نہ دینے سے دوری پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ہدیہ دے اور اس کو قبول نہ کیا جائے تو اس کا برعکس اثر ہوگا، آپس میں نفرتیں بڑھیں گی، باہمی تعلقات میں کھنچاؤ اور تناؤ کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح کی کیفیت دیر تک باقی رہے تو ایسے ماحول میں کوئی تعمیری کام کرنا سرے سے ناممکن ہو جائے گا۔ اِسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایا کے تبادلے کی تلقین بھی کی اور خود بھی اس پر عمل فرمایا۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ہدیہ دیا جاتا تو آپ خوشی کے ساتھ اس کو قبول فرماتے تھے: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الهدية.

(فتح الباري بشرح صحيح البخاري: 249/5)

اب جہاں تک اہلِ اسلام سے ہدیہ قبول کرنے کا تعلق ہے، اس میں احادیث میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، لیکن غیر مسلموں کے سلسلے میں روایت میں اختلاف ہے۔ کچھ روایتیں بتاتی ہیں کہ کسی غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے شوق کے ساتھ اس کو قبول فرمایا۔ دوسری طرف ایسی بھی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا: إني لا أقبل هدية مشرك. (فتح الباري: 5/273)

سنن أبي داؤد (باب في الإمام يقبل هدايا المشركين) میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم فدک (غیر مسلم حکمراں) کا ہدیہ قبول فرمایا۔ پھر عین اسی باب میں دوسری روایت ہے کہ ایک غیر مسلم نے ہدیہ پیش کیا تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا. (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 3055)

یہاں واضح طور پر ایک ہی معاملے میں دو مختلف مسلک اختیار کیا گیا۔ مگر یہ کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اس فرق کا سبب نفسِ حکم کا فرق نہیں ہے، بلکہ حالات کا فرق ہے اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ حالات کی رعایت ہمیشہ ایک حکم کے انطباق میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ اس معاملے کی وضاحت کے لئے یہاں دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

1۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار حاکموں اور سرداروں سے ہدیہ قبول فرمایا۔ مثلاً تبوک کی مہم (رجب 9 ہجری) میں آپ نے تیس ہزار اصحاب کے ساتھ سفر فرمایا تھا۔ اِس مہم کے ذیل میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس علاقے کے مقام ایلہ کا حاکم یوحنا بن روبہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اس نے آپ کو ایک سفید خچر کا ہدیہ پیش کیا، جو واضح طور پر اس بات کی علامت تھی وہ آپ کے ساتھ اچھے تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ چناں چہ آپ نے خوشی کے ساتھ اس کا ہدیہ قبول فرمایا۔ اس کے بعد معتدل فضا میں اس سے بات ہوئی۔ اس نے آپ سے صلح کر لی اور جزیہ دینے پر راضی ہو گیا۔ (فتح الباري: 405/3)۔

یہ واقعہ واضح طور پر تالیف قلب کا واقعہ ہے۔ ایک حاکم جس سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے، اگر اس کا ہدیہ قبول نہ کیا جائے تو تلخی پیدا ہوگی اور بہتر تعلقات قائم کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اس کے برعکس، اس کا ہدیہ قبول کرنا اور اپنی طرف سے اس کو ہدیہ پیش کرنا قربت اور انس کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر مسلم حاکموں سے ان کا تحفہ قبول فرمایا۔ سرداروں اور حکمرانوں سے ہدیہ قبول کرنے کے متعدد واقعات حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ سنن أبي داؤد (رقم الحديث: 3057) اور بعض دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مشرک عیاض بن حمار المجاشعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی بطور ہدیہ پیش کی۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اسلام قبول کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا: فإني نهيت عن زَبد المشركين (مجھے مشرکوں کا عطیہ لینے سے منع کیا گیا ہے). فتح الباري 273/5۔

واقعات بتاتے ہیں کہ یہ انکار حقیقۃً کوئی انکار نہ تھا، بلکہ وہ شفقت کا ایک معاملہ تھا۔ اپنی زبان میں ہم اس کو ایک قسم کا ترغیبی انکار کہہ سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عیاض بن حمار آپ کی تحریک توحید سے متاثر تھے اور ذاتی طور پر آپ کے عقیدت مند بن چکے تھے۔ مگر ابھی تک انھوں نے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ آپ نے مذکورہ الفاظ میں ہدیہ کا انکار کرکے اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ حسبِ توقع اس کا مفید اثر ہوا اور جلد ہی انھوں نے باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔ چناں چہ اب اُن کو اسلام کی تاریخ میں عیاض بن حمار المجاشعی رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے۔ (1997)

حدیثِ رسول: افادیت کے چند پہلو

حدیث کے لفظی معنی بات (word) کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر حدیث سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر وہ بات ہے جو آپ نے کہا یا جس پر آپ نے عمل کیا یا جس کی آپ نے تصدیق کی۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آیا ہے کہ: وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68:4) یعنی بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔ اِس آیت میں 'عظیم' کا لفظ شخصی تعریف کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ دینِ خداوندی میں جس اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے، تم اُس اعلیٰ اخلاق کا عملی نمونہ ہو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ کا اخلاق کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ: کان خلقه القرآن (الأدب المفرد، رقم الحدیث: 308) یعنی آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ حضرت عائشہ کا یہ قول حدیثِ رسول یا سنتِ رسول کی اصل حقیقت کو بتاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کا عملی انطباق تھے۔ قرآن اگر قرآن ہے تو رسول اللہ کی حیثیت انطباقی قرآن (applied Quran) کی ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ایک ہے اسپریچویلٹی اور دوسری چیز ہے اپلائڈ اسپریچویلٹی (applied spirituality)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے جو کتابی مجموعے تیار کیے گئے ہیں، اُن کی تعداد تقریباً 50 تک پہنچتی ہے۔ یہ احادیث گویا رسول اللہ کی پوری زندگی کا تعارف ہیں۔ آج کل کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ احادیث کا مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور عمل کا انسائکلو پیڈیا ہے۔ اِن احادیث میں جو مختلف مضامین آئے ہیں، اُن کا اشارہ قرآن میں موجود ہے۔

احادیث کے دس اہم پہلو

1۔ **حدیث تبیینِ قرآن:** قرآن، دینِ خداوندی کی بنیادی تعلیمات (basics) کا مجموعہ ہے۔ حدیث اس کی تفصیل ہے جو کہ خود مہبطِ قرآن کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔

2۔ **حدیث اسوۂ رسول:** خدا کی کتاب پر عمل کرنے والا سب سے پہلا شخص ہمیشہ خود پیغمبر ہوتا ہے۔ حدیث پیغمبر کے اِسی عمل کا ریکارڈ ہے۔

3۔ **حدیث پوائنٹ آف ریفرنس:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی واقعات سے بھری ہوئی زندگی تھی، اِس لیے آپ کی زندگی میں حیاتِ انسانی کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کے حوالے موجود ہیں۔

4۔ **حدیث معیارِ حق:** حدیث بتاتی ہے کہ کسی معاملے میں فیصلے کا صحیح معیار (right criterion) کیا ہے، انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔

5۔ **حدیث صحبتِ رسول:** بعد کے زمانے کے لوگوں کے لیے حدیث صحبتِ رسول

(companionship of the Prophet) کا بدل ہے۔ حدیث صحبتِ رسول کا تسلسل ہے۔ حدیث کے ذریعے ہر آدمی گویا اصحابِ رسول جیسا تجربہ کرسکتا ہے۔

6۔ **حدیث پیغمبرانہ معرفت:** حدیث ایک اعتبار سے، پیغمبرانہ معرفت کا ریکارڈ ہے۔ اِس اعتبار سے، حدیث کا ذخیرہ حصولِ معرفت کے لیے ایک بنیادی رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔

7۔ **حدیث نقطۂ آغاز:** حدیث کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کو ہر معاملے میں درست نقطۂ آغاز (right starting point) ملتا ہے۔ اِس طرح اُس کے لیے ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو حقیقی معنوں میں نتیجہ خیز بنا سکے۔

8۔ **حدیث دلیلِ نبوت:** حدیث کا استثنائی اسلوب اور اس کی استثنائی معنویت اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ اس کا مطالعہ قاری کے لیے نبوت کی دلیل بن جاتا ہے۔

9۔ **حدیث تاریخی دستاویز:** حدیث پیغمبر کی سرگرمیوں کا ریکارڈ ہے۔ اِس اعتبار سے، حدیث پیغمبر کے حق میں تاریخی دستاویز (historical document) کی حیثیت رکھتی ہے۔

10۔ **حدیث وحیِ غیر متلو:** قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو۔ اِس اعتبار سے حدیث کا مطالعہ گویا قرآن کے مطالعے کی توسیع (extension) کے ہم معنی ہے۔

حدیث تبیینِ قرآن

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اِس میں دین کی تمام بنیادی تعلیمات کو بتادیا گیا ہے۔ تاہم اِن تعلیمات کی تفصیل قرآن میں موجود نہیں۔ یہ تفصیل یا توجیہہ صحابہ (ہم عصر اہلِ ایمان) نے براہِ راست طور پر رسول سے حاصل کی۔ اس کے بعد یہ تمام معلومات احادیث کی حیثیت سے جمع ہوئیں اور پھر کتبِ حدیث کی صورت میں مدون ہوگئیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اِس طرح بیان کی گئی ہے: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (16:64) یعنی ہم نے تم پر کتاب صرف اِس لیے اتاری ہے کہ تم اُن کو وہ چیز کھول کر سنادو جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔ اور وہ ہدایت اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

قرآن کی اِس آیت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح ہیں۔ رسول کی حیثیت 'مہبطِ قرآن' کی ہے۔ آپ نے قرآن کی جس آیت کی جو تشریح کی، وہی اصلاً اُس آیت کی مستند تشریح ہے۔ یہاں اِس معاملے کی وضاحت کے لیے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

سورہ العنکبوت میں یہ آیت آئی ہے: اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) یعنی تم اِس کتاب کو پڑھو جو تم پر وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ اسلام میں نماز ایک بے حد اہم عبادت ہے۔ لیکن اِس عبادت کی عملی صورت کیا ہو، اس کو جاننے کے لیے ایک زندہ انسان کی ضرورت ہے۔ یہ معیاری انسان ہم کو رسول کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ اِس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: صلوا کما رأیتموني، أصلي (السنن الکبری للبیهقي، رقم الحدیث: 3672) یعنی تم نماز اُس طرح پڑھو، جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ صحابہ نے رسول کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کو احادیث کے ذریعے امت تک پہنچایا۔

قرآن کی ایک آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے: كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (96:19) یعنی ہرگز نہیں، اس کی بات نہ مان اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ اِس آیت میں سجدۂ قربت سے کیا مراد ہے، اس کا علم ایک حدیث سے ہوتا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: تعبد الله کأنك تراه (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 4499) یعنی اللہ کی عبادت اِس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ مذکورہ آیت اور حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ عابد کا شعور اتنا ترقی کرے کہ اس کو خدا کی موجودگی (presence of God) کا تجربہ ہونے لگے۔ یہ احساس اتنا شدید ہو کہ عابد کو یہ محسوس ہونے لگے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

حج بھی ایک عبادت ہے۔ حجۃ الوداع کی روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جس سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اسامہ بن شُریک ایک صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منیٰ میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔ کوئی شخص کہتا کہ اے خدا کے رسول، میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی، کوئی کہتا کہ میں نے رمیِ جمار سے پہلے حلق کرالیا، کسی نے کہا کہ میں نے پہلے قربانی کی اور اس کے بعد میں نے رمی کیا۔ اِسی طرح لوگ مختلف قسم کے سوالات پوچھتے رہے۔ آپ اِس قسم کے سوالات کے جواب میں فرماتے: افعل و لا حرج، افعل و لا حرج، لا حرج إلا على رجل افترض عِرض رجل مسلم، وهو ظالم، فذلك الذي حرج وهلك (صحيح مسلم، رقم الحديث: 329) یعنی کرلو، کوئی حرج نہیں۔ کرلو، کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو بے عزت کرے۔ ایسا ہی شخص ظالم ہے۔ اُسی نے حرج والا کام کیا اور ہلاک ہوا۔

اِس حدیث رسول سے ایک اہم بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ عبادت میں اصل اہمیت عبادت کی اسپرٹ کی ہے۔ جہاں تک عبادت کے فارم کا تعلق ہے، وہ عملاً ضروری ہے، لیکن اگر عبادت کے فارم میں بظاہر کوئی فرق واقع ہوجائے تو وہ اللہ کے نزدیک قابلِ قبول ہے، بشرطیکہ عبادت کی اسپرٹ میں فرق نہ ہوا ہو۔ گویا کہ عبادت میں عابد کا فوکس سب سے زیادہ عبادت کی اسپرٹ پر ہونا چاہئے، نہ کہ عبادت کے فارم پر۔

حدیث اسوۂ رسول

قرآن کی سورہ الاحزاب میں یہ آیت آئی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا (33:21) یعنی تمھارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے، اُس شخص کے لیے جو اللہ کا اور وہ آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

قرآن کی یہ آیت غزوہ احزاب (5 ہجری) کے بعد اتری۔ اِس اعتبار سے، اُس کا ایک انطباق وہ ہے جو اِس غزوہ کے دوران ظاہر ہوا۔ لیکن اِسی کے ساتھ اُس کا ایک وسیع تر انطباق بھی ہے۔

اِس اعتبار سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اہلِ ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزوۂ احزاب کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے، اُن کی تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہاں اِس سلسلے کی صرف ایک روایت نقل کی جاتی ہے جو اپنے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے نہایت جامع ہے۔ اس میں پوری زندگی کے لیے رہنمائی ملتی ہے۔

غزوہ احزاب 5 ہجری میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بارہ ہزار کا لشکر مکہ سے روانہ ہوا ہے اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے اِس معاملے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی کے مشورے سے یہ طے ہوا کہ ٹکراؤ سے بچنے کے لیے یہ کیا جائے کہ مدینہ کے شمال مغربی حصے میں دو پہاڑوں کے درمیان ایک خندق (trench) کھود دی جائے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ اہلِ مکہ کا لشکر جب مدینہ کی سرحد پر پہنچا تو خندق پر اُن کو اپنی پیش قدمی روکنی پڑی۔ یہ اہلِ عرب کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ چناں چہ اس کو دیکھ کر لشکر کے سردار نے کہا: واللہ إن ھذہ لمکیدۃ ما کانت العرب تکیدھا (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: 182/4) یعنی خدا کی قسم، یہ ایک ایسی تدبیر ہے جیسی تدبیر سے اہلِ عرب اب تک ناواقف تھے۔

یہ خندق لشکر کی مزید پیش قدمی کے لیے رکاوٹ (buffer) بن گئی۔ تقریباً ایک مہینہ پڑاؤ ڈالنے کے بعد اہلِ مکہ واپس چلے گئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ واقعہ صرف ایک وقتی واقعہ نہیں، اِس واقعے میں انسانی زندگی کے لیے ایک جامع رہنمائی موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب ٹکراؤ کی صورت پیش آئے تو اُس وقت تم ٹکراؤ کا آپشن نہ لو، بلکہ یک طرفہ تدبیر کے ذریعے اپنے اور فریقِ ثانی کے درمیان ایک آڑ یا فاصل (buffer) قائم کرلو۔ اِس طرح تم متشددانہ ٹکراؤ اور اس کے نقصان سے بچ جاؤ گے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں مختلف صورتوں میں اِس طریقے کو اختیار کیا۔ مثلاً غزوۂ حدیبیہ (6 ہجری) کے موقع پر آپ نے فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر اُن سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ (no-war pact) کرلیا۔ یہ بھی اپنے اور فریقِ ثانی کے درمیان

فاصل قائم کرنے کی ایک صورت تھی۔ اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصبر معول المؤمن (حلیۃ الأولیاء: 342/5) یعنی صبر مومن کی ڈھال ہے۔ گویا اجتماعی زندگی میں صبر کا طریقہ اپنے اور فریقِ ثانی کے درمیان فاصل قائم کرنے کی ایک صورت ہے۔

نزاع کے موقع پر اپنے اور فریقِ ثانی کے درمیان فاصل (buffer) قائم کرنا ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو مہلت حاصل کرنے کی تدبیر (buying-time method) کہا جاسکتا ہے۔ اِس تدبیر کے ذریعے آدمی کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کو ٹکراؤ میں ضائع کرنے سے بچ جائے۔ وہ اِس حاصل شدہ وقت کو موقع (opportunity) کے طور پر استعمال کرے۔

حدیث پوائنٹ آف ریفرنس

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اور آپ کے اصحاب کی زندگی واقعات سے بھری ہوئی زندگی (eventful life) تھی۔ آپ کی زندگی میں اور آپ کے اصحاب کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے اور پھر یہ واقعات حدیثوں کی صورت میں ریکارڈ ہو گئے۔ جو شخص رسول اور اصحابِ رسول کی زندگی کا مطالعہ کرے گا، وہ حیرت انگیز طور پر پائے گا کہ اس کے اندر حقیقی واقعات موجود ہیں۔ اِس بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کی زندگی کے حوالے سے ہر معاملے میں مستند رہنمائی حاصل کی جاسکے۔

اِس معاملے کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو روایت میں اِس طرح آیا ہے: و كانت قريش إنما تسمى رسول الله صلى الله عليه وسلم مذمما، ثم يسبّونه- فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ألا تعجبون لما صرف الله عنّي من أذى قريش- يسبّون ويهجون مذمما وأنا محمد (السيرة النبوية لابن هشام: 201/2) یعنی قریش (مکی دور میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذمّم (مذمت کیا ہوا) کے نام سے پکارتے تھے اور پھر آپ کو برا بھلا کہتے تھے۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے اصحاب سے) کہتے تھے کہ کیا تم کو اِس پر تعجب نہیں ہے کہ اللہ نے مجھے قریش کی اذیت سے بچا لیا ہے۔ وہ مذمم کہہ کر میری ہجو کرتے ہیں، حالاں کہ میرا نام محمد ہے۔

اِس واقعے سے زندگی کا ایک اہم اصول ملتا ہے، وہ یہ کہ جب کوئی شخص اشتعال کی بات کرے تو سننے والا خوب صورت جواب دے کر اس کو غیر موثر بنا دے۔ یہ زندگی کی ایک حکمت ہے۔ اِس حکمت کو دوسرے الفاظ میں، اویسیور پلائی (evasive reply) کہا جا سکتا ہے۔

اِس معاملے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ایک بار حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص وہاں آیا اور آ کر وہ حضرت ابوبکر کو برا بھلا کہنے لگا۔ حضرت ابوبکر پہلی بار سن کر چپ رہے۔ اس نے دوسری بار ان کو برا بھلا کہا تو اُس وقت بھی وہ چپ رہے۔ مگر جب اس نے تیسری بار ان کو برا بھلا کہا تو حضرت ابوبکر خاموش نہ رہ سکے اور جواب میں بول پڑے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں اٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابوبکر، جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمھاری طرف سے جواب دے رہا تھا، جب تم بول پڑے تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا: إن الملك كان يرد عنك، فلما تكلمتَ، ذهب الملك، ووقع الشيطان، وكرهتُ أن أجلس (شرح السنة للبغوي، رقم الحديث: 3586)

اِس واقعے میں فرشتے کا لفظ کسی پراسرار معنی میں نہیں ہے۔ اِس سے مراد عملاً وہی ہے جس کو قرآن میں النفس اللوامة (75:2) یعنی ضمیر (conscience) کہا گیا ہے۔ اِس واقعے میں یہ عمومی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو ناحق ستائے تو تم صرف یہ کرو کہ ردعمل کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے خاموش ہو جاؤ۔ تمھاری خاموشی کا یہ فائدہ ہوگا کہ مذکورہ شخص کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ اِس طرح تم خود اپنے مخالف کے اندر اپنا ایک حامی پیدا کر سکتے ہو۔

حدیث معیارِ حق

زندگی کی ایک اہم ضرورت وہ ہے جس کو معیار (criterion) کہا جاتا ہے۔ زندگی کے معاملات میں ہمیشہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی معیار ہو جس کے حوالے سے معاملے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دین میں یہ حیثیت مستند طور پر صرف دو چیزوں کو حاصل ہے — قرآن اور حدیث۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ایک آیت میں اِس طرح بیان کی گئی ہے: فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ

وَالرَّسُوْلِ (4:59) یعنی (اے ایمان والو) اگر تمھارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوجائے تو تم اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن میں دین کی اساسی تعلیمات بتائی گئی ہیں اور تفصیل کے اعتبار سے زندگی کے بہت سے معاملات ہیں جن کے بارے میں ہم کو احادیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ اِس طرح قرآن اور حدیث کی صورت میں ایک ایسا مستند معیار مل جاتا ہے جو لوگوں کو اِس سے بچاتا ہے کہ لوگ خود اپنے ذہن (mindset) سے رائے قائم کریں۔ اِس طرح یہ اصول حاصل ہوتا ہے کہ ہر نزاعی موقع پر قرآن اور حدیث کے حوالے سے لوگوں کو صحیح طریقے کی رہنمائی دی جاسکے۔ اگر قرآن اور حدیث کا معیار موجود نہ ہو تو کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس کے حوالے سے لوگوں کو مستند طور پر کوئی رہنمائی دی جاسکے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی غیر موافق بات نظر آتی ہے تو لوگ فوراً اس کے خلاف ٹکراؤ کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس طرح کے معاملے میں کارروائی نہ کرنا بزدلی ہے۔ یہ ذہن لوگوں کے اندر بہت زیادہ عام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اِس معاملے میں فیصلہ کن رہنمائی کہاں سے حاصل کی جائے۔ اِس کا جواب ہمیں ایک حدیث میں ملتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا ینبغي للمؤمن أن یُذلّ نفسه قالوا: و کیف یذل نفسه؟ قال: یتعرض من البلاء لما لا یُطیق (الترمذي، رقم الحدیث: 2254) یعنی مومن کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی آزمائش کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی اس کے اندر طاقت نہ ہو۔

اِس حدیث رسول سے اجتماعی زندگی کے لیے ایک اہم اصول ملتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام کرنا صرف اُس وقت جائز ہے جب کہ اقدام سے کوئی مثبت نتیجہ (positive result) نکلنے والا ہو۔ جس اقدام کا نتیجہ منفی صورت میں نکلنے والا ہو، ایسا اقدام کرنا مومن کا طریقہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو اقدام کاؤنٹر پروڈکٹیو (counterproductive) ثابت ہونے والا ہو، اُس سے مومن کو اُسی طرح بچنا چاہیے جس طرح کسی حرام فعل سے بچا جاتا ہے۔

حدیث صحبتِ رسول

حدیث کیا ہے، وہ گویا صحبتِ رسول کی مستند رپورٹ ہے۔ حدیث کی کتابوں میں جو روایتیں جمع کی گئی ہیں، اُن کی نوعیت یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے ساتھ آپ کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ وہ نہایت غور کے ساتھ آپ کی باتیں سنتے تھے۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے سے پہلے لوگوں کے حافظے نہایت قوی ہوتے تھے۔ چناں چہ رسول اللہ کی کہی ہوئی باتیں لوگوں کو پوری طرح یاد ہوجاتی تھیں۔ بعد کو اِن باتوں کو باقاعدہ طور پر لکھا جانے لگا۔ اِس طرح حدیث کی وہ کتابیں تیار ہوئیں جو اب ہمارے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال ہمیشہ فطری اسلوب میں ہوتے تھے۔ آج اگر کوئی شخص اِن اقوالِ رسول کو توجہ کے ساتھ پڑھے، وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو اُس ماحول میں پہنچادے، جب کہ یہ باتیں کہی جارہی تھیں، تو پڑھنے والے کو اپنی شعوری بیداری کی بنا پر ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ پیغمبر کی صحبت میں پہنچ گیا ہے اور براہِ راست طور پر آپ کی باتوں کو سن رہا ہے۔ اِس طرح احادیث نے گویا کہ پیغمبر کی صحبت کو ابدی بنادیا ہے۔ اِس کی ایک مثال مشہور حدیث جبریل ہے۔ جو حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح مسلم میں اس کو باب بیان الإیمان کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

آپ یکسو ہوکر اور استحضار کے ساتھ اِس حدیث کو پڑھیں تو حدیث کا متن آپ کو اِس طرح اپنی طرف کھینچ لے گا کہ آپ محسوس کریں گے کہ آپ بھی مدینہ کی اُس مجلس میں ہیں جہاں پیغمبر اور جبریل کے درمیان یہ مکالمہ ہوا— تقریباً یہی معاملہ تمام دوسری حدیثوں کا بھی ہے۔

حدیث پیغمبرانہ معرفت

احادیث کا جو مجموعہ مختلف کتابوں کی صورت میں مرتب ہوا ہے، وہ سادہ طور پر صرف پیغمبر کے اقوال کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ وہ پیغمبر کی شخصیت کا مکمل تعارف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی انسان کا کلام اُس انسان کا تعارف ہوتا ہے۔ یہ بات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں مزید اضافے کے ساتھ درست ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک روایت کا مطالعہ کیجئے: أمرني ربي بتسع: خشية الله

في السر والعلانية، وكلمة العدل في الغضب والرضا، والقصد في الفقر والغنا، وأن أصل من قطعني، وأعطي من حرمني، وأعفوا عن من ظلمني، وأن يكون صمتي فكراً، ونطقي ذكراً، ونظري عبرة (جامع الأصول، رقم الحديث: 9317) یعنی میرے رب نے مجھے 9 باتوں کا حکم دیا ہے: کھلے اور چھپے ہر حال میں، میں خدا سے ڈرتا رہوں۔ غصے میں ہوں یا خوشی میں، ہمیشہ انصاف کی بات کہوں۔ محتاجی اور امیری دونوں حالتوں میں، میں اعتدال پر قائم رہوں۔ جو مجھ سے کٹے، میں اُس سے جُڑوں۔ جو مجھے محروم کرے، میں اُس کو دوں۔ جو مجھ پر ظلم کرے، میں اس کو معاف کردوں۔ میری خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہو۔ میرا بولنا یادِ الٰہی کا بولنا ہو۔ میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

اِس حدیث کو بار بار پڑھیے۔ اِس پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے۔ اگر آپ سنجیدگی کے ساتھ ایسا کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ پیغمبر کو دیکھے بغیر دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ پیغمبر کی شخصیت آپ کے سامنے مستحضر ہوگئی ہو۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ پیغمبر کے ذوق (taste) کو دریافت کررہے ہیں۔ آپ پیغمبر کی ترجیحات (priorities) سے باخبر ہورہے ہیں۔ آپ کو نظر آرہا ہوگا کہ پیغمبر کے ذہن میں کس قسم کا تھاٹ پراسس (thought process) چلتا رہتا تھا۔ پیغمبر کی اخلاقی قدریں (moral values) کیا تھیں جن کے مطابق، وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرتا تھا۔ پیغمبر کے دن اور رات کن کیفیات میں بسر ہوتے تھے، وغیرہ۔

غرض یہ کہ آپ اِس روایت اور دوسری روایتوں میں غور کرکے پیغمبر کی اعلیٰ ربانی شخصیت کی پوری تصویر دیکھ سکتے ہیں، حتی کہ آپ کا شعور مکمل طور پر بیدار ہو تو آپ کی یہ دریافت تقریباً اتنا ہی زیادہ حقیقی ہوسکتی ہے، جتنا کہ پیغمبر کے ہم عصر اہلِ ایمان کی دریافت ہوسکتی تھی۔

حدیث نقطۂ آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کامل معنوں میں ایک عملی انسان تھے۔ آپ نے زیرو (zero) سے اپنے مشن کا آغاز کیا اور پھر اس کو کمال کے درجے تک پہنچایا۔ اِس اعتبار سے، آپ کی زندگی میں اِس مشکل مسئلے کا ایک کامیاب نمونہ ملتا ہے کہ اپنے عمل کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ آپ کی حدیثیں آپ کی

اِسی عملی زندگی کا ریکارڈ ہیں۔آپ کی حدیثوں کے مطالعے سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا درست نقطہ آغاز (right starting point) کیا ہے۔

اِس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ کے مشن کا ایک جُز یہ تھا کہ کعبہ کی عمارت کو بتوں سے پاک کیا جائے، جہاں اُس وقت تقریباً 360 بت رکھے ہوئے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ کعبہ میں جاتے تھے۔آپ وہاں نماز پڑھتے تھے۔لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتے تھے۔لیکن مکی دور کے 13 سال تک آپ نے کبھی اِن بتوں سے تعرض نہیں کیا، حتی کہ کعبہ میں ان کی موجودگی پر احتجاج بھی نہیں کیا، حالاں کہ آپ کے مشن میں یہ شامل تھا کہ کعبہ سے بتوں کا خاتمہ کیا جائے، جیسا کہ آپ نے فتحِ مکہ کے بعد کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس عمل سے ایک اہم اصول اخذ ہوتا ہے، وہ یہ کہ کسی عمل کا نقطہ آغاز کیا ہے۔کسی عمل کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ بالواسطہ طور پر پُرامن دعوت کی شکل میں اپنے عمل کا آغاز کیا جائے۔جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے، وہ صرف اس وقت کیا جائے جب کہ وہ پوری طرح ممکن ہو چکا ہو، جب وہ وقت آجائے کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا کیے بغیر اس کو تکمیلی سطح تک پہنچایا جائے۔

حدیث دلیلِ نبوت

حدیث کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کی ایک محکم دلیل ہے، یعنی کلام اپنے آپ میں یہ گواہی دیتا ہے کہ متکلم کوئی عام انسان نہ تھا، بلکہ وہ اللہ رب العالمین کا پیغمبر تھا۔حدیث کے ذخیرے میں اِس طرح کی بہت سی روایتیں ہیں۔یہاں اِس سلسلے میں صرف ایک حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا: أنا سيد وُلد آدم، ولا فخر، ولواء الحمد بيدي يوم القيامة، ولا فخر (سنن ابن ماجه، رقم الحديث: 4308) یعنی میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔اور قیامت کے دن حمد کا علَم میرے ہاتھ میں ہوگا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول آپ کی فضیلت کے بارے میں نہیں ہے۔وہ دراصل ایک تاریخی واقعہ کی پیشین گوئی ہے۔اِس میں ایک ایسے واقعے کا ذکر ہے جو اِسی دنیا میں پیش آئے گا۔

قیامت میں جو کچھ ہوگا، وہ صرف یہ کہ قیامت میں ہر چیز سے التباس کا پردہ اٹھ جائے گا۔ اِس لیے قیامت میں ہر ایک بلا اشتباہ اُس واقعے کو جان لے گا جو موجودہ دنیا میں ایک تاریخ کے طور پر پیش آیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ساتویں صدی کے ربع اول میں کہی تھی۔ اُس وقت کے حالات میں بظاہر اس کا ادنی امکان نہیں تھا کہ آپ کسی وقت پوری نسلِ انسانی میں نمایاں ترین شخص کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

یہ بات صرف اللہ رب العالمین کے علم میں تھی کہ وہ خاتم النبیین کو ایک ایسی تاریخی شخصیت (historical figure) کا درجہ دینے والا ہے جو تمام نسلِ انسانی میں ممتاز ترین درجہ ہے۔ یہ اِس لیے تھا کہ لوگوں کے لیے آپ کو پہچاننا ممکن ہوجائے۔ 'وسید وُلد آدم' کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ — استثنائی طور پر تاریخ کا عظیم ترین انسان:

Exceptionally, the greatest man of history.

یہ اللہ کا ایک منصوبہ تھا جو اِس لیے تھا کہ خاتم النبیین کو خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے پہچاننا لوگوں کے لیے مشکل نہ رہے۔ چناں چہ اللہ کے مخصوص منصوبے کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ایسا تاریخی عمل (historical process) جاری ہوا کہ رسول اللہ کی ذات بطور ایک تاریخی واقعہ کے پوری انسانی نسل کی نمایاں ترین شخصیت بن گئی۔ یہ ایک ایسا معلوم واقعہ ہے کہ سیکولر مبصرین نے بھی عام طور پر اس کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں اِس سلسلے میں صرف دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔

مشہور کمیونسٹ رائٹر ایم این رائے (وفات: 1954) کی ایک کتاب ہے جو 1939 میں پہلی بار دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب تقریباً 100 صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Historical Role of Islam

مصنف نے اپنی اِس کتاب میں دورِ اول میں پیش آنے والے اسلامی انقلاب کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں — اسلام کا پھیلاؤ تمام معجزاتی واقعات میں سب سے بڑا معجزاتی واقعہ تھا:

The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (p. 4)

یہ سب سے بڑا معجزاتی واقعہ کیا تھا۔ یہ دراصل رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے پیش آنے والا وہ فکری انقلاب تھا جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ایک عظیم تاریخی عمل (great historical process) شروع ہوا، جو مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اِس نقطہ انتہا پر پہنچا کہ پیغمبر اسلام کی ذات مسلمہ طور پر پوری نسلِ انسانی کے درمیان ممتاز ترین شخصیت بن گئی۔ یہی وہ تاریخی واقعہ ہے جس کو پیغمبر اسلام نے 'سید ولد آدم' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایم این رائے نے اپنی کتاب میں جس واقعے کا ذکر غیر معمولی معجزہ کے طور پر کیا ہے، وہ اِس معاملے کے اُس پہلو سے تعلق رکھتا ہے جس کو عالمی انقلابی عمل کہا جاسکتا ہے، جس کے نتیجے کے طور پر پیغمبر اسلام کی شخصیت پوری نسل آدم میں ممتاز ترین شخصیت بن گئی۔

اِس انقلابی واقعے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِسی ممتاز حیثیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس موضوع پر ایک مشہور کتاب وہ ہے جو امریکا کے ایک مسیحی مصنف ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے شائع کی ہے۔ مصنف نے اپنی اِس کتاب میں پوری انسانی تاریخ کے ایک سو ممتاز ترین افراد کی لسٹ تیار کی ہے۔ یہ افراد مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس کتاب میں انھوں نے ان تمام افراد کا ترتیب وار ذکر کیا ہے۔ اِس فہرست میں سب سے پہلا نام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ مصنف نے پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں— آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے، مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی:

> Muhammad was the only man in history who was supremely successful on both, the religious and secular levels. (Dr. Michael H. Hart, *The 100,* New York 1978)

ڈاکٹر مائکل ہارٹ کی یہ کتاب گویا 'سید ولد آدم' کی تاریخی تشریح ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات 14 سو سال پہلے کہی تھی، وہ اُس وقت ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہزار سالہ عمل کے بعد یہ پیشین گوئی ایک تاریخی واقعہ بنی۔ یہ بات عملی طور پر اتنی زیادہ مسلّم ہوگئی کہ موجودہ زمانے کے بہت سے مبصرین نے کھلے طور پر اِس واقعے کا اعتراف کیا ہے۔

انھیں میں سے ایک امریکی مصنف ڈاکٹر مائکل ہارٹ ہیں۔

حدیث تاریخی دستاویز

احادیث کی ایک اہم حیثیت یہ ہے کہ وہ اسلام اور شخصیاتِ اسلام کے لیے ایک تاریخی دستاویز (historical document) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ احادیث ایک اعتبار سے، اسلام کے مسائل بتاتی ہیں اور دوسرے اعتبار سے، وہ اسلام کی مستند تاریخ ہیں۔ حدیث اور سیرت پر جو کتابیں تیار کی گئی ہیں، وہ گویا تاریخ اسلام کی جلدیں ہیں۔ احادیث کا یہی مجموعہ ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو ایک مستند تاریخی بنیاد (historical base) حاصل ہوگئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہت سے پیغمبر آئے، لیکن اِن تمام پیغمبروں کی شخصیت غیر تاریخی شخصیت بن کر رہ گئی، حتی کہ حضرت مسیح جو پیغمبر اسلام سے صرف 6 سو سال پہلے پیدا ہوئے، اُن کے بارے میں بھی معتبر تاریخی روایات موجود نہیں۔ چناں چہ برٹرنڈ رسل (وفات: 1970) نے لکھا ہے کہ — تاریخی طور پر یہ بات بالکل مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all.

ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ کیوں ایسا ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایک واحد استثنا کے طور پر تاریخی پیغمبر مانا جاتا ہے۔ پروفیسر فلپ کے ہٹی نے لکھا ہے کہ — محمد تاریخ کی مکمل روشنی میں پیدا ہوئے:

Muhammad was born within the full light of history.

ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا (وفات: 1910) ایک بنگالی اسکالر تھے۔ انھوں نے تمام مذاہب اور مذہبی شخصیتوں کا مطالعہ کیا۔ اپنے اِس مطالعے کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ انھوں نے اپنے اِس مطالعے کی تفصیل بتاتے ہوئے اپنی کتاب میں یہ الفاظ لکھے ہیں — اف، یہ کتنی بڑی راحت کی بات ہے کہ آدمی آخر کار حقیقی معنوں میں ایک ایسے تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ یقین کر سکے:

Oh, what a relief to find after all a truly historical prophet to believe in.

جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیا آئے، اُن میں سے کسی کو تاریخی شخصیت (historical figure) کا درجہ حاصل نہیں۔ خالص علمی اعتبار سے، پچھلے تمام انبیا اعتقادی انبیا ہیں، نہ کہ تاریخی انبیا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کو استثنائی طور پر تاریخی شخصیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ دوسری تمام شخصیتیں جن کو تاریخی شخصیت کہا جاتا ہے، اُن کو یہ درجہ صرف اِس لیے حاصل ہوا کہ مدوّن تاریخ (recorded history) کی صورت میں تاریخ کا جو ذخیرہ تیار ہوا ہے، اس میں اُن کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام کو جو تاریخی حیثیت ملی، وہ اصلاً مدوّن تاریخ کے ریکارڈ کی بنا پر نہیں ملی۔ پھر اِس استثنائی واقعے کا سبب کیا تھا۔

اِس کا سبب وہ لٹریچر ہے جس کو حدیث لٹریچر کہا جاتا ہے۔ حدیث لٹریچر صرف شرعی احکام کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ وہ اُن تاریخی واقعات کا مجموعہ بھی ہے جو پیغمبر اسلام کی زندگی میں پیش آئے۔ پیغمبر اسلام واحد پیغمبر تھے جو اپنی 23 سالہ پیغمبرانہ زندگی میں ایک وسیع ٹیم بنانے میں کامیاب ہوئے، جن کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔

یہ اصحابِ رسول یا پیغمبر اسلام کی ہم عصر ٹیم (contemporary team) آپ کی پوری زندگی میں آپ کے ساتھ رہی۔ انھوں نے آپ کے ساتھ دعوت الی اللہ کا کام کیا۔ وہ آپ کے ساتھ حج اور عبادت میں شریک ہوئے۔ سفر اور حضر میں وہ آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ صلح اور جنگ کے تمام مواقع پر وہ آپ کے ساتھ شریک رہے۔ انھوں نے آپ کی انفرادی زندگی کو بھی دیکھا اور آپ کی اجتماعی سرگرمیوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے اِن تمام پہلوؤں کو انھوں نے محفوظ کیا۔ حفاظتِ احادیث کا یہ سلسلہ اصحابِ رسول کے بعد بھی نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ حدیث کی وہ کتابیں تیار ہو گئیں جو اب ہر کتب خانے میں مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔

احادیثِ رسول کے ناقل جن کو رُواۃ (narrators) کہا جاتا ہے، وہ سادہ طور پر صرف ناقلِ حدیث نہ تھے، بلکہ اِسی کے ساتھ وہ ناقلِ تاریخ بھی تھے۔ انھوں نے پیغمبر اسلام کی زندگی کی تمام سرگرمیوں کو نہایت صحت کے ساتھ محفوظ کر دیا۔ یہی وہ ریکارڈ ہے جس نے پیغمبر اسلام کو

خالص علمی اعتبار سے، ثابت شدہ طور پر تاریخی پیغمبر کا درجہ دے دیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، اسلام کے دو مستند ماخذ ہیں — قرآن اور حدیث۔ جہاں تک اسلام کی بنیادی تعلیمات کا معاملہ ہے، وہ سب کی سب قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام کی زندگی کا وہ حصہ جس کو تاریخ کہا جاتا ہے، اُس کا مستند ماخذ صرف احادیث کا ذخیرہ ہے۔ احادیث کو اگر حذف کر دیا جائے تو اسلام اور پیغمبر اسلام کی تاریخی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ اِس کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام کی حیثیت صرف ایک عقیدے کی ہوگی، نہ کہ تاریخ کی۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ قرآن میں استثنائی طور پر اس کو فتح مبین (clear victory) کہا گیا ہے۔ لیکن اِس واقعے کی تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں۔ اِس واقعے کی تمام تفصیلات ہم کو حدیث اور سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہی معاملہ پیغمبر اسلام کی زندگی کے دوسرے تمام واقعات کا ہے۔

حدیث وحیِ غیر متلو

قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو، یعنی قرآن خدا کا مبنی بر وحی کلام (revealed word of God) ہے اور حدیث خدا کا مبنی بر الہام کلام (inspired word of God) قرآن اگر حدیثِ قدسی ہے تو حدیث، حدیثِ رسول۔ قرآن اگر لفظی قرآن ہے تو حدیث گویا معنوی قرآن۔ قرآن اور حدیث دونوں کا اصل منبع (source) ایک ہے۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے کسی پیچیدہ فنی بحث کی ضرورت نہیں، قرآن اور حدیث کا سادہ مطالعہ ہی اِس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اگر آپ عربی زبان جانتے ہیں اور آپ کے اندر متاثر ذہن (preoccupied mind) نہیں ہے تو آپ کا کامن سنس (common sense) ہی اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ قرآن اور حدیث کے اسلوب میں واضح فرق موجود ہے۔ زبان کے اشتراک کے باوجود صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا متکلم اور ہے اور حدیث کا متکلم اور۔

اسلوب کے اِس فرق کے باوجود جہاں تک معنی کی بات ہے، معنی کے اعتبار سے، دونوں کے

اندر کامل مشابہت پائی جاتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو معنوی سرچشمہ قرآن کا ہے، وہی معنوی سرچشمہ حدیث کا بھی ہے۔ اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک روایت کا مطالعہ کیجئے: وعلى العاقل مالم يكن مغلوباً على عقله أن تكون له ساعات: ساعة يناجي فيها ربّه، وساعة يحاسب فيها نفسه، وساعة يتفكر فيها في صنع الله، وساعة يخلو فيها لحاجته من المطعم والمشرب- (صحيح ابن حبان، رقم الحديث: 361) یعنی عقل مند شخص کے لیے لازم ہے کہ اُس پر کچھ لمحات گزریں— ایسا لمحہ جب کہ وہ اپنے رب سے باتیں کرے، ایسا لمحہ جب کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ کرے، ایسا لمحہ جب کہ وہ خدا کی تخلیق میں غور کر رہا ہو اور ایسا لمحہ جب کہ وہ کھانے اور پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔

اِس حدیثِ رسول کا مطالعہ کیجئے۔ اِس حدیث کا ربانی مزاج اور اس کا الہامی اسلوب اپنی روح کے اعتبار سے، اُس دین کی نمائندگی کر رہا ہے جو دین قرآن میں پایا جاتا ہے۔

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

Spiritual Writings of Maulana Wahiduddin Khan

www.goodwordbooks.com